اسلامی معاشرے میں

غیر مسلموں کے حقوق و فرائض

یوسف القرضاوی

مترجم

قیصر شہزاد

ادارہ تحقیقات اسلامی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔ اسلام آباد

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ لَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ

اسلامی معاشرے میں غیر مسلموں کے حقوق و فرائض

تالیف

یوسف القرضاوی

ترجمہ و تحقیق

قیصر شہزاد

ادارہ تحقیقات اسلامی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

کتاب: اسلامی معاشرے میں غیر مسلموں کے حقوق و فرائض

مؤلف: یوسف القرضاوی

مترجم: قیصر شہزاد

ڈاکٹر محمد حمید اللہ لائبریری، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی

کوائف فہرست سازی دوران طباعت

یوسف القرضاوی
اسلامی معاشرے میں غیر مسلموں کے حقوق و فرائض
(ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد)
۱۔ اسلامی ریاست۔حقوق و فرائض
۲۔ اسلامی ریاست۔حقوق و فرائض۔غیر مسلم
الف۔ عنوان

اشاعت ۲۰۱۱ء

ISBN: 978-969-408-322-3

مطبع: مطبع ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد

فہرست

تقدیم

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سلسلۂ نبوت ختم ہوگیا اور اللہ کی طرف سے نبیوں کے ذریعے انسانوں کی ہدایت کا عمل مکمل ہوگیا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اللہ کی معرفت عطا کر دی گئی ہے اور بنیادی امور بشمول اللہ اور انسان کے تعلق، حیات و کائنات اور دنیا و آخرت کے بارے میں انسان کو علم فراہم کر کے اسے عقل و شعور کے اعتبار سے بلوغت کے درجے تک پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ اب اس قابل ہے کہ خود غور وفکر کر کے حق و باطل اور ہدایت و گمراہی میں امتیاز کر سکے، اپنے راستے کا انتخاب کر سکے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مقاصد حیات کے حصول کی تگ و دو میں ایک ذی شعور انسان کی حیثیت سے حصہ لے سکے۔ **لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی** اسے یہ حق دیتا ہے کہ وہ عقل و دلیل کی رہنمائی میں اسلام قبول کرے یا کوئی اور مذہب اختیار کر لے اور اس اعتماد کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اپنی فہم کی بنیاد پر صحیح راستے کے انتخاب کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اسلام ذی شعور انسان کے عقل و تفکر کی اہمیت ہی کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ احترام آدم لازم کر کے اس کے شرف و فضیلت پر ایک اور مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ عقل و استدلال کی صلاحیت اور قدر و اختیار رکھنے والا انسان واجب الاحترام ہے۔ اس کی تکریم اور اس کے مرتبے کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے جہاں تک بنیادی انسانی حقوق کا تعلق ہے ان کے بارے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ نبی کریمؐ نے اس اصول کو عملی جامہ پہنا کر ہر زمانے کے لیے مثال قائم کر دی۔ چنانچہ تاریخ کے ہر دور میں مسلم معاشرے میں یہ اصول کارفرما نظر آتا ہے۔ میثاق مدینہ ہو، خلافت راشدہ ہو یا

اس کے بعد کے ادوار۔ شام و بغداد ہوں، مصر و ہسپانیہ ہوں یا ترکی و ہندوستان۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم معاشروں میں غیر مسلموں کو بڑی حد تک وہی انسانی حقوق حاصل تھے جو مسلمانوں کو تھے۔ غیر مسلموں کی جان و مال کا نہ صرف احترام کیا جاتا تھا بلکہ انہیں قانونی تحفظ بھی فراہم کیا جاتا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے لیے کسی غیر مسلم پر جبر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنے مذہب پر عمل اور اپنے طریقے پر عبادت کرنے، اپنی عبادت گاہیں قائم کرنے، اپنا خاندان تشکیل دینے، کھیتی باڑی، تجارت یا کوئی اور کاروبار کرنے، ریاست کی فراہم کردہ شہری سہولتوں سے فائدہ اٹھانے سمیت ان کے تمام حقوق تسلیم کیے جاتے تھے اور عملاً انہیں وہی تمام شہری مراعات حاصل تھیں جن سے خود مسلمان مستفید تھے۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے معاملات میں اپنے قوانین کے اجرا کا حق تھا اور ایک طرح کی اندرونی خود مختاری بھی حاصل تھی۔ البتہ ریاست کے دفاع کی ذمہ داری جو مسلمانوں پر عائد تھی اس سے اقلیتیں مستثنیٰ تھیں۔ اس استثنیٰ کے عوض ان سے جزیے کی شکل میں ایک ٹیکس وصول کیا جاتا تھا جو ایک شہری کی حیثیت سے ملک کے دفاع میں ان کی شرکت کی ایک متبادل شکل تھی۔ یہ ٹیکس ادا کر کے انہیں ذمی کی حیثیت حاصل ہو جاتی تھی، یعنی ریاست ان کے جان و مال اور دیگر انسانی حقوق کے تحفظ کا ذمہ لے لیتی تھی۔ ذمی قرار پانے سے بحیثیت شہری ان کی حیثیت میں کوئی تخفیف نہیں ہوتی تھی بلکہ انہیں ریاست کی امان و حفاظت کی ضمانت حاصل ہو جاتی تھی۔

اسلام کے سائے میں بسنے والے غیر مسلموں کے حقوق کے احترام کا اندازہ نبی کریم ﷺ کی اس حدیث سے ہوتا ہے کہ ”جو کوئی کسی ذمی کو تکلیف پہنچائے گا وہ مجھے تکلیف پہنچائے گا اور جو مجھے تکلیف پہنچائے گا وہ اللہ کو ناراض کرے گا“۔ ایک اور

حدیث کے مطابق آپؐ نے فرمایا کہ ''روز حشر کسی ذمی کو تکلیف دینے یا نقصان پہنچانے والے کے خلاف بارگاہ الٰہی میں، میں خود مستغیث ہوں گا''۔ خلافت راشدہ اور بعد کے ادوار سے فراہم مسلسل مثالوں سے بھی یہ عیاں ہے کہ ریاست ذمیوں کے بارے میں اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے پرجوش و مستعد رہتی تھی۔ غیر مسلموں کے ساتھ برتی جانے والی رواداری اور ان کے ساتھ کیا جانے والا فیاضانہ سلوک مسلمانوں کی تاریخ کی ایک درخشاں روایت ہے۔ اقلیتوں کے ساتھ اس سے بہتر سلوک کی مثال آج کا مزعومہ ترقی یافتہ دور بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مسلمانوں نے برصغیر جنوبی ایشیا پر صدیوں حکومت کی۔ جب انیسویں صدی میں ان کے اقتدار کا خاتمہ ہوا اس وقت برصغیر میں غیر مسلموں کی تعداد مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھی اور اقتصادی، تعلیمی اور معاشرتی لحاظ سے بھی وہ مسلمانوں سے پیچھے نہیں تھے۔ مسلمانوں کے اپنے زیرنگیں غیر مسلموں سے فیاضانہ سلوک کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہوسکتا ہے؟

غیر مسلموں کے ساتھ مسلم معاشروں میں عدل و انصاف اور رواداری کی تابناک روایات کے باوجود بعض افراد تاریخ کو جھٹلانے کی جسارت کرتے ہیں۔ بعض حلقے اسلامی نظام نافذ کرنے سے دامن بچانے کے لیے غیر مسلم اقلیتوں کی موجودگی کا بہانہ تراشتے ہیں اور واضح و مستحکم اسلامی قانونی، سیاسی اور معاشرتی روایات سے صرف نظر کر کے اس بے جواز اندیشے کا اظہار کرتے ہیں کہ نفاذ اسلام کی صورت میں اقلیتیں ظلم و زیادتی کا شکار ہو سکتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی کمزور حکومت قانون کے مؤثر نفاذ میں عمومی طور پر کوتاہی کی مرتکب ہو۔ معترضین کے بے بنیاد دعووں اور شکوک و شبہات کے جواب میں مشہور مصری عالم و فقیہ الشیخ یوسف عبداللہ القرضاوی نے عربی زبان میں غیر المسلمین

فی المجتمع الإسلامی تصنیف کی تھی۔ یہ کتاب اس موضوع پر فقہی دلائل، تاریخی حقائق اور فکری مباحث کا ایک قابل قدر مجموعہ ہے اور قبولِ عام حاصل کر چکی ہے۔ کتاب کی علمی افادیت کے پیش نظر ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اس کا ترجمہ پیش کرنے میں مسرت محسوس کرتا ہے۔ یہ ترجمہ ادارہ کے ایک فاضل رکن اور لیکچرر قیصر شہزاد کی کاوش کا نتیجہ ہے جس کے لیے ہم ان کے شکرگزار ہیں۔

شعبۂ تدوین واشاعت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

تمام تعریفوں کی سزاوار ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔

صلاۃ و سلام تمام انبیاء، بطورِ خاص خاتم و صفوۃ الرسل محمد بن عبداللہ، آپ کی آل و اصحاب اور آپ کی پیروی کرنے والوں پر!

مسلمان ماضی میں ایک کفر و فجور میں مبتلا سامراج سے دوچار رہے جس نے نہ صرف انہیں ان کی تاریخی شناخت سے محروم کر دیا بلکہ ان پر غیر اسلامی، سامراجی تصورات، قوانین اور رسوم پر مبنی ایک اجنبی نظام بھی مسلط کر دیا۔ یہ مقصد ابتداء میں تو بزورِ طاقت مگر بعد میں حیلوں بہانوں سے کام لیتے ہوئے حاصل کیا گیا۔ اسلامی ممالک سے اس سامراج کے رخصت ہونے پر بالآخر مسلمانوں کو اس سے رہائی نصیب ہوئی اور زمامِ کار خود ان کے ہاتھ آ گئی۔ تب اکنافِ عالم سے یہ مطالبہ سنائی دیا کہ اسلامی عقائد کی رہنمائی، اخلاقی تعلیمات اور نظریات کی روشنی میں اُس جامع اسلامی زندگی کا از سرِ نو آغاز کیا جائے جس کا اللہ نے حکم دیا اور جسے ان کے لیے اس نے اور خود انھوں نے بھی پسند کیا۔

سامراج کی موجودگی یا بیرونی مداخلت کے بہانے سے محروم ہو جانے کے بعد نفاذِ شریعت سے بچنے کے لیے کچھ لوگوں نے دوسرے عذر تراشنے شروع کر دیے، مثلاً ممالکِ اسلامیہ میں غیر مسلم اقلیتوں کی موجودگی کا بہانہ کیا گیا۔ یعنی کہا گیا کہ شریعت اسلامی کا نفاذ ان غیر مسلم شہریوں پر ظلم اور ان کی مذہبی و تاریخی شناخت کی تباہی کے مترادف ہو گا! یہ لوگ اس بات کو فراموش کر بیٹھے کہ اسلام کے سائے میں غیر مسلموں نے صدیوں تک امن و عدل کے ساتھ بالکل مسلمانوں ہی کی طرح زندگی بسر کی اور اگر کبھی وہ ظلم کا شکار ہوئے

بھی تو یہ ظلم صرف ان ہی کے ساتھ روا نہیں رکھا گیا بلکہ ان کے ساتھ اور کبھی ان سے پہلے ہی خود مسلم رعایا بھی اس کا شکار ہوئی۔

مقامِ حیرت تو یہ ہے کہ بعض لوگوں نے تاریخ کو جھٹلانے اور اسکی زبان سے وہ کچھ کہلوانے کی جسارت کی جس کے شواہد ہی موجود نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ تاریخی متون کی تحریف کی کوشش کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے ۔ وہ فقط یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے مذاہب وافکار کے پیروؤں کے ساتھ اسلامی رواداری کے اس عظیم نمونے کی شکل مسخ کریں جس کی نظیر پیش کرنے سے ازمنہ قدیم وجدید کی انسانیت قاصر ہے ۔ چنانچہ ہم نے مسلم اور غیر مسلم متلاشیانِ حقیقت کے لیے، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، یہ کتاب سپردِ قلم کرنے کا فیصلہ کیا۔

ہماری یہ تحقیقی کاوش علم وفکر پر مبنی ہے ۔ اسکا بنیادی تعلق فقہ و تاریخ کے شعبوں سے ہے۔ اس کے مقاصد تعمیری ہیں کیوں کہ یہ تفریق کی جگہ قربت اور موافقت پیدا کرنا چاہتی ہے۔

یہ کتاب مستند ترین مصادر، محکم اور مضبوط دلائل سے استدلال کرتے ہوئے ہمیں بتائے گی کہ مسلم معاشرے میں رہنے والے غیر مسلموں کی شرعی حیثیت کیا ہے اور خود اسلام ان کے کن حقوق کی ضمانت دیتا ہے اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ حقوق ادا بھی کیے جائیں گے ؟؛ ان حقوق کے عوض ان لوگوں پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور ان کے حوالے سے کیا شبہات اٹھائے گئے ہیں؟؛ یہ لوگ جنہیں اسلام نے اللہ، اسکے رسول اور مسلم معاشرے کی ذمہ داری میں دیا ، ماضی ، خصوصاً ابتدائے اسلام کے سنہرے ادوار میں کس طرح زندگی بسر کرتے تھے؟۔ اس کا موازنہ اس سلوک سے کیا جائے گا جو دیگر ادیان غیروں کے ساتھ کرتے رہے اور جو سلوک جدید افکار اور انقلابی نظریات کے پرچارک اپنے

مخالفین کے ساتھ کر رہے ہیں

امید ہے کہ یہ صفحات اس باب میں کامیابی سے حقیقت کی پردہ کشائی اور ازالہء شکوک کریں گے اور تعصب اور جانبداری سے پاک حقائق لوگوں کے سامنے لائیں گے۔ عصر حاضر میں جب معاشرتی سلامتی اور ملکی وحدت کے مقابلے میں طبقاتی کشمکش کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں، اس امر کی ضرورت اور زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دستِ دعا بلند کرتے ہیں کہ وہ دلوں کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے، انہیں محبت سے منور کرے اور ذہنوں کو معرفت و یقین سے ہدایت یافتہ بنا دے۔ بے شک وہ دعاؤں کا سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔۔۔

آمین

تمہید

اسلامی معاشرہ ایک نظریاتی معاشرہ ہے

اسلامی معاشرہ ایک مخصوص عقیدے اور نظریے کی بنیاد پر قائم ہے جو اس کے تمام اداروں، احکام، قوانین اور اخلاقی اقدار کا مصدر و منبع ہے۔ یہ نظریۂ اسلام ہے اور اسی پر مبنی ہونے کے باعث یہ معاشرہ اسلامی معاشرہ کہلانے کا مستحق بنتا ہے۔ چنانچہ اسلامی معاشرہ ایک ایسا معاشرہ ہے جو اسلام کو اپنے منہج حیات ، دستورِ حکومت، قانون سازی اور زندگی کے تمام شعبوں اور انفرادی و اجتماعی ،مادی و غیر مادی ، مقامی و بین الاقوامی تعلقات کے سرچشمے کے طور پر اپنا چکا ہو۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی معاشرہ اپنے اندر بسنے والے دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے تمام عناصر کا قلع قمع کرنے کے درپے ہوتا ہے ۔ وہ اپنے مسلم اور غیر مسلم شہریوں کے باہمی تعلقات کی بنیاد رواداری، عدل، نیکی اور رحمت پر رکھتا ہے۔ ۔قبل از اسلام انسانیت ان اقدار سے ناواقف تھی بلکہ ان کے فقدان کے باعث اسلام کے صدیوں بعد بھی مصائب میں مبتلا رہی اور آج تک مبتلا ہے۔ انسان ان اقدار کو جدید معاشروں میں نافذ کرنے کی کوشش تو ضرور کرتا ہے مگر جب بھی کسی معاشرے میں یہ اس ہدف کے حصول میں کامیاب ہونے لگتا ہے ہوس ،عصبیت ، تنگ نظری اور انانیت اس پر غالب آ جاتی ہیں اور یوں اسے دین ، مذہب ،جنس یا رنگ کی بنیاد پر دائمی پیکار کی طرف لے جاتی ہیں۔

غیر مسلموں سے تعلقات کا دستور

غیر مسلموں سے اس تعلق کی بنیاد اس ارشاد باری پر ہے۔

﴿اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں'' ﴾۔(۱)

لہذا مسلمانوں کو تمام انسانوں کے ساتھ (اگر چہ وہ ان کے دین کا انکار ہی کیوں نہ کرتے ہوں) نیکی اور انصاف کا حکم دیا گیا ہے (جب تک کہ وہ اسلام کی راہ میں روڑے نہ اٹکائیں اور مسلمانوں پر ظلم نہ کریں) ۔ معاملات اور قانون سازی کے باب میں غیر مسلموں میں سے اہل کتاب ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اہلِ کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا دین دراصل کسی آسمانی صحیفہ پر مبنی تھا مگر بعد میں اس میں تحریف کر دی گئی مثلاً یہود و نصاریٰ جن کے دین کی بنیاد تورات اور انجیل پر ہے۔اس لئے قرآن ان لوگوں کے ساتھ صرف اچھائی کے ساتھ دینی مباحثے کی اجازت دیتا ہے تاکہ دلوں میں کدورت پنپنے نہ پائے اور بحث و جدل تعصب و بغض کی آگ کو بھڑکا نہ سکے۔ ارشاد باری ہے

﴿اور اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے ۔۔۔ سوائے ان لوگوں

کے جو ان میں سے ظالم ہوں۔۔۔۔۔اور ان سے کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی۔ ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے مسلم فرمانبردار ہیں ﴾۔(۲)

علاوہ ازیں اسلام اہل کتاب کے ساتھ کھانے پینے اور ان کا ذبیحہ استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اسی طرح ان سے رشتہ کرنا اور ان کی پاکدامن عفیفہ عورتوں سے نکاح کرنا بھی جائز قرار دیا گیا ہے۔

قرآن میں درج ذیل ارشاد باری نے ازدواجی زندگی کو محبت و رحمت پر قائم قرار دیا ہے

﴿اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش، اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمند لوگوں کے لیے ﴾۔(۳)

اسلامی رواداری کی عظمت کا ایک مظہر یہ ہے کہ اسلام مسلمان کو اجازت دیتا ہے کہ اس کے گھر کی نگران، اسکی شریک حیات اور اس کے بچوں کی ماں غیر مسلم ہو اور یہ کہ اس کے بچوں کی خالہ اور خالو کا تعلق غیر مسلموں سے ہو۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے

﴿ آج تمہارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے۔ اور محفوظ عورتیں بھی تمہارے لیے حلال ہیں خواہ وہ اہلِ ایمان کے گروہ سے ہوں یا ان قوموں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے

نکاح میں ان کے محافظ بنو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرنے لگو﴾۔(۴)

یہ حکم تو دارالاسلام سے باہر کے اہل کتاب کا ہے جہاں تک دارالاسلام کے غیر مسلم شہریوں کا تعلق ہے تو شرع اسلامی میں ان کی ایک خاص حیثیت اور ایک خاص معاملہ ہے۔ یہ لوگ ''اہل ذمہ'' کہلاتے ہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ اس اصطلاح سے کیا مراد ہے؟

''اهل الذمة''

اسلامی اصطلاح میں مسلم معاشرے میں موجود غیر مسلم شہریوں کو ''اہل ذمہ'' یا ''ذمی'' کے نام سے جانا جاتا ہے لفظ ''الذمة'' کے معنی ''عہد، ضمانت اور امان'' کے ہیں۔ ان لوگوں کو یہ نام اس لیے دیا گیا کیوں کہ ان کے ساتھ اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کی طرف سے ایک ایسا معاہدہ کیا گیا ہے جو انہیں اسلامی معاشرے میں اسلام کے زیر سایہ محفوظ و مطمئن زندگی کی ضمانت دیتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے معاہدہء ذمہ کی بنا پر ان کی امان اور ضمانت میں ہیں۔ معاہدۂ ذمہ سے غیر مسلموں کو تقریباً وہی حقوق حاصل ہوتے ہیں جو معاصر ریاست کی جانب سے رعایا کو ''شہریت'' ملنے پر دیئے جاتے ہیں اور ویسی ہی ذمہ داریاں بھی ان پر عائد ہوتی ہیں۔

اس بنا پر فقہاء کی اصطلاح میں(۵) ''ذمی'' ''اہل دارالاسلام'' میں شامل کیے جاتے ہیں جبکہ معاصر علماء کی زبان(۶) میں وہ ''اسلامی شہریت'' کے حامل ہیں۔ یاد رہے کہ معاہدہ ذمہ ایک دائمی معاہدہ ہے جس کی رو سے غیر مسلم اپنے دین پر قائم رہ سکتے ہیں اور انہیں مسلمانوں کی طرف سے حفاظت اور نگہبانی کی ضمانت اس شرط پر ملتی ہے کہ وہ جزیہ کی

ادائیگی کے ساتھ ساتھ دنیاوی امور میں شریعتِ اسلامی کی پاسداری کریں اور یوں ''اہلِ دار الاسلام'' میں شامل ہو جائیں۔

چنانچہ یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس کی رو سے ہر فریق پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کے عوض اسے کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں

آیئے دیکھتے ہیں یہ حقوق و فرائض کیا ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ سورۃ الممتحنہ: ۸ سے ۹۔

۲۔ سورۃ العنکبوت :۴۶۔

۳۔ سورۃ الروم۔ ۲۱۔

۴۔ سورۃ المائدہ۔ ۵۔

۵۔ دیکھئے ، ابوبکر محمد بن ابی سہل السرخسی ، شرح السیر الکبیر ، (بیروت: دار الکتب العلمیة ،۱۹۹۷) جلد ۱، ص ۱۴۵ ؛ ابوبکر مسعود بن احمد الکاسانی، بدائع الصنائع ، (بیروت: دار الکتب العلمیة ،۱۹۸۶) جلد ۵، ص ۴۹۷؛ موفق الدین عبداللہ ابن قدامہ، المغنی (قاہرۃ:ھجر، ۱۹۹۲) جلد ۱۳، ص ۵۰۸۔

۶۔ دیکھئے، عبدالقادر عودۃ شہید، التشریع الجنائی الاسلامی ، (قاہرۃ: مکتبة دار العروبة ، ۱۹۵۹ء) ج ۱،ص ۳۰۷، پیرانمبر ۲۳۲؛ ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، أحکام الذمیین والمستأمنین فی الاسلام ، (طبعة اولی ، ۱۹۶۳ء)، ص ۶۳ سے ۶۶، پیراگراف ۴۹ سے ۵۱۔

بابِ اول

ذمیوں کے حقوق

اسلامی معاشرے میں مقیم ذمیوں کے ساتھ معاملات کا اساسی اصول یہ ہے کہ چند متعین امور کے علاوہ انہیں مسلمانوں کے مساوی حقوق حاصل ہونگے اور چند مستثنیات کے علاوہ ان پر مسلمانوں کی سی ذمہ داریاں بھی عائد ہونگی۔

تحفظ کا حق

ذمیوں کے حقوق میں اولین حق اسلامی ریاست اور معاشرے کی جانب سے تحفظ کی فراہمی کا ہے جس میں تمام خارجی خطرات اور داخلی مظالم سے بچاؤ شامل ہے۔ اس حق کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ امن وامان اور سکون و اطمینان حاصل کرسکیں۔

ا۔ بیرونی حملوں سے تحفظ

بیرونی حملوں سے دفاع کے حوالے سے ذمیوں کے حقوق مسلمانوں کے مساوی ہیں۔ چنانچہ مسلمان حاکم وقت پر اقتدار اور فوجی قوت رکھنے کے باعث یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ انہیں یہ حفاظت بہم پہنچائے۔ حنابلہ کی کتاب مطالب أولي النهى کے مصنف رقمطراز ہیں ''اہل ذمہ کی حفاظت، ہر موذی سے بچاؤ، ان کے قیدیوں کی رہائی اور ان کی ایذارسانی کے درپے شخص کی روک تھام حاکم پر واجب ہے بشرطیکہ وہ دار الحرب میں نہ ہوں بلکہ ہماری سرزمین پر ہوں اگرچہ اپنے علاقے میں ہی رہتے ہوں''۔ اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ''ان پر اسلامی احکام کے علاوہ ان کے ساتھ کئے جانے والا معاہدہ دائمی

حیثیت رکھتا ہے لہذا حاکم اس معاہدے کا اسی طرح پابند ہو گا جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے عہد کا پابند ہے''۔(۱) امام شہاب الدین القرافی مالکی نے اپنی کتاب الفروق میں فقہِ ظاہری کے امام ابن حزم کا قول ان کی کتاب مراتب الاجماع سے نقل کیا ہے کہ کسی ذمی کے درپے اگر کوئی ہمارے ملک پر چڑھائی کرے تو اس سے قتال کے لئے جیسے بھی بن پڑے نکلنا اور اس ذمی کی خاطر جان تک دے دینا ہم پر واجب ہے۔ یہ حکم ایک ایسے شخص کی حفاظت کی خاطر دیا جا رہا ہے جس کا ذمہ اللہ اور اس کے رسول نے لیا ہے اور اس حد تک جائے بغیر اس شخص کو دشمنوں کے حوالے کر دینا معاہدہ ذمہ سے غفلت برتنے کے مترادف ہے۔(۲) اس سلسلے میں انہوں نے امت کا اجماع نقل کیا ہے۔

علامہ قرافی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں ۔

''وہ معاہدہ جس کے تقاضے پورے کرنے میں جان و مال کا تلف روا ہو یقیناً ایک عظیم الشان معاہدہ ہے۔''(۳)

اس اسلامی اصول کے اطلاق کی ایک مثال شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے موقف کی صورت میں اس وقت سامنے آئی جب تاتاری شام پر غلبہ پا چکے تھے اور شیخ ''قطلو شاہ'' سے قیدیوں کی رہائی کے معاملہ میں گفتگو کے لئے تشریف لے گئے ۔ تاتاری حکمران نے مسلمان قیدیوں کی رہائی کی اجازت تو دے دی مگر ذمی قیدیوں کو رہا کرنے سے انکار کر دیا۔ شیخ الاسلام کا جواب فقط یہ تھا: ''ہم تمام یہودی و نصرانی قیدیوں کی رہائی سے کم پر ہرگز راضی نہ ہوں گے کیونکہ وہ لوگ ہماری ذمہ داری میں ہیں اور ہم کوئی ذمی یا غیر ذمی قیدی (آپکی قید میں) نہ چھوڑیں گے''۔بادشاہ نے جب ان کا اس قدر اصرار اور سخت موقف دیکھا تو ذمیوں کو بھی آزاد کر دیا۔

ب۔ داخلی ظلم وستم سے حفاظت:

داخلی ظلم وستم سے حفاظت کو اسلام واجب قرار دیتا، اس کے وجوب کے باب میں بہت سختی کرتا اور مسلمانوں کو اپنے قول وفعل سے ذمیوں کے ساتھ زیادتی کرنے یا انکی ایذاء رسانی سے سے متنبہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ تو ظالموں سے محبت رکھتا ہے اور نہ انہیں ہدایت عطا فرماتا ہے۔ بلکہ ان پر یا تو دنیا میں ہی اپنا عذاب نازل کردیتا ہے یا انہیں آخرت تک مہلت دے دیتا ہے جہاں انہیں دوگنا عذاب دیا جائے گا۔ بے شمار آیات و احادیث میں ظلم کی تحریم بیان کی گئی، اسکی مذمت کی گئی اور دنیا و آخرت میں اس کے برے نتائج سے خبردار کیا گیا ہے۔ جبکہ غیر مسلم معاہدین وذمیوں پر ظلم کی بطورِخاص تنبیہ میں کچھ احادیث بھی موجود ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

''جس نے معاہد پر ظلم کیا، اس کے حق میں کمی کی یا اسے اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف بنایا یا اس سے کوئی چیز چھین لی تو قیامت کے دن میں اس (مظلوم) کی طرف سے مدعی بنوں گا''۔(۴)

رسول اللہ ﷺ سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ ''جس شخص نے ذمی کو ایذاء پہنچائی میں اس کے خلاف فریق بنوں گا اور ایسے شخص کی مخالفت میں روزِ قیامت کروں گا''۔(۵) اور یہ کہ'' جس نے ذمی کو ایذا دی اس نے مجھے تکلیف پہنچائی اور جس نے مجھے تکلیف پہنچائی اس نے اللہ کو اذیت دی''۔(۶)

اہل نجران کے ساتھ کیئے گئے معاہدۂ نبوی میں مرقوم تھا:'' ایک فرد کے ظلم کا مواخذہ کسی دوسرے فرد سے نہیں کیا جائے گا''۔(۷) ان تمام باتوں کے پیشِ نظر مسلمانوں کے

ہاں خلفاء راشدین کے عہد سے اس بات کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا کہ ذمیوں سے ظلم کا ازالہ کیا جائے ان پر کی جانے والی زیادتی کو روکا جائے اور ان کی جانب سے کی گئی ہر شکایت دور کی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ صوبوں سے آنے والے وفود سے ذمیوں کا حال دریافت فرماتے مبادا کسی مسلمان نے انہیں تکلیف پہنچائی ہو۔ انہیں عموماً یہی جواب ملتا ''ہمیں تو ایفائے عہد ہی نظر آتا ہے''۔(۸) یعنی ان کے اور مسلمانوں کے درمیان معاہدے کی تمام شرائط پوری کی جا رہی ہیں یعنی فریقین اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ اسی طرح حضرت علیؓ کہا کرتے تھے کہ ذمی جزیہ صرف اس لئے ادا کرتے ہیں کہ ان کے جان و مال اسی طرح مقدس ہو جائیں جیسے ہمارے جان و مال ہیں۔(۹)

تمام مسالک کے مسلم فقہاء اس بات کی وضاحت نہایت تاکید سے کرتے ہیں کہ ذمیوں پر ہونے والے ظلم کو روکنا اور ان کی حفاظت کرنا مسلمانوں کا فرض اور ذمہ داری ہے کیونکہ اپنے ذمہ میں لینے کے باعث مسلمان ان لوگوں سے ظلم روکنے کے پابند ہو گئے تھے اور یہ لوگ ذمہ کی وجہ سے دارالاسلام کے باشندوں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ بلکہ بعض فقہاء نے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ ایک ذمی پر ظلم کرنے کا گناہ ایک مسلمان پر ظلم کرنے سے زیادہ ہے۔(۱۰)

ج۔ جانی تحفظ

ذمیوں کو جانی تحفظ کا حق بالکل اسی طرح حاصل ہے جیسے مال و آبرو کے تحفظ کا حق۔ چنانچہ مسلمان متفق ہیں کہ ان کی عزت و آبرو اور جانیں معصوم ہیں اور ان کا قتل حرام ہے۔ نبی اکرمؐ کا فرمان ہے: ''جس شخص نے معاہد کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو تک نہ سونگھ

سکے گا۔ حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے محسوس کی جا سکتی ہے"۔(۱۱)

چنانچہ اس حدیث میں سنائی گئی وعید کی بنا پر تمام فقہائے اسلام قتل کو گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں البتہ ذمی کے قتل کی سزا کے طور پر مسلمان کو سزائے موت دیے جانے پر ان کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔امام شافعی اور امام احمد سمیت فقہاء کی اکثریت کے مطابق مسلمان کو ذمی کے قتل کے جرم میں نہیں مارا نہیں جاسکتا۔ ان کا استدلال ایک صحیح حدیث سے ہے جس کے مطابق "مسلم کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جا سکتا" (۱۲) علاوہ ازیں ایک دوسری حدیث میں ارشادِ نبوی ہے کہ "خبردار مومن کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا"۔(۱۳)

دوسری جانب امام مالک اور امام لیث کا کہنا ہے کہ ذمی کے مسلمان قاتل کو سزائے موت صرف اس صورت میں دی جا سکتی ہے جب اس نے یہ قتل فریب یا دغا دے کر کیا ہو۔(۱۴) ابان ابن عثمان کی امارتِ مدینہ کے زمانے میں کسی مسلمان نے دغا دے کر ایک نبطی کو قتل کر دیا۔ انہوں نے بدلے میں مسلمان کو قتل کیا۔ یاد رہے کہ ابان فقہائے مدینہ سے ہیں۔(۱۵)امام شعبی، ابراہیم نخعی، ابن ابی لیلی، عثمان بُستی، ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے مطابق مسلمان کو ذمی کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ یہ رائے ان نصوص سے استدلال پر مبنی ہے جو قصاص کو واجب قرار دیتی ہیں علاوہ ازیں اس کی بنیاد خونِ ناحق بہانے کی دائمی حرمت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اس حدیث پر ہے جس کے مطابق انہوں نے ایک مسلمان کو معاہد کے بدلے قتل کیا اور فرمایا اپنے عہد کو پورا کرنے والوں میں میں سب سے زیادہ کریم ہوں۔(بروایتِ عبدالرزاق و بیہقی)۔(۱۶)

اسی طرح حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ان کے پاس ایک ذمی کے قتل میں ماخوذ مسلمان کو لایا گیا۔ جرم ثابت ہونے پر انہوں نے اسے سزائے موت سنائی۔ اس پر مقتول کا بھائی حاضر ہوا اور کہا کہ وہ قاتل کو معاف کرتا ہے۔حضرت علیؓ نے اس سے مخاطب

ہو کر سوال کیا: ''کہیں ایسا تو نہیں کہ ان لوگوں نے تمہیں ڈرایا یا دھمکایا ہے وہ کہنے لگا اس کا قتل مجھے میرا بھائی واپس نہیں دلا سکتا۔ اس کے علاوہ انہوں نے مجھے خون بہا ادا کیا ہے اور میں راضی ہوں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا (اس بارے میں) تو زیادہ جانتا ہے۔ جو شخص ہمارے ذمہ میں ہو اس کا خون ہمارے خون کی طرح ہے اور اس کی دیت ہماری دیت جیسی ہے۔(روایتِ بیہقی)۔(۱۷) ایک اور روایت کے مطابق انہوں نے فرمایا: ''وہ لوگ جزیہ (صرف) اس لئے ادا کرتے ہیں تا کہ ان کے خون ہمارے خون کی مانند (محفوظ) ہو جائیں اور ان کے مال ہمارے اموال کی مانند۔''

جبکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حوالے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انہوں نے ایک حاکم کو ذمی کے مسلمان قاتل کے متعلق خط میں حکم دیا کہ اسے مقتول کے لواحقین کے حوالے کر دیا جائے اور انہیں اختیار دیا جائے کہ اسے قتل کریں یا معاف کردیں۔ چنانچہ قاتل انکے حوالے کر دیا گیا۔ انہوں نے اسے قتل کر دیا۔(۱۸) علماء کا کہنا ہے کہ اسی لئے ذمی کا مال چرانے پر مسلمان کا ہاتھ کاٹا جائے گا حالانکہ مال کا معاملہ جان سے فروتر ہے۔ جہاں تک نبی ﷺ کے اس ارشاد کا تعلق ہے کہ ''مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے'' تو اس سے مراد حربی کافر ہے۔ ہماری پیش کردہ اس تشریح کی روشنی میں نصوص باہم متفق و موافق ہو جاتی ہیں اور ان کا اختلاف باقی نہیں رہتا۔(۱۹) خلافت عثمانیہ میں اسی رائے پر اعتماد کیا جاتا رہا اور مختلف صوبوں میں صدیوں تک اسی کا نفاذ رہا۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی میں دشمنان اسلام کی کوششوں سے خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔

اسلام ذمیوں کو جس طرح جانی تحفظ فراہم کرتا ہے اسی طرح جسمانی تشدد اور مار پیٹ سے بھی ان کی حفاظت کرتا ہے چنانچہ اسلامی قانون ان کو جزیہ کی ادائیگی میں تاخیر کرنے یا اپنے مالی واجبات۔ مثلاً جزیہ یا خراج۔ کی ادائیگی روک دینے پر بھی جسمانی

ایذا پہنچانے کی اجازت نہیں دیتا۔ جبکہ زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے مسلمانوں کے سلسلے میں وہ نہایت سخت موقف اپناتا ہے۔

مالی واجبات ادا نہ کرنے والے ذمیوں کے سلسلے میں فقہاء نے زیادہ سے زیادہ تادیباً قید جائز قرار دی ہے اور وہ بھی ایسی جس میں کسی طرح کا تشدد یا مشقت شامل نہ ہو۔ ۔ اس بارے میں امام ابو یوسفؒ رقمطراز ہیں کہ ایک صحابی حکیمؓ بن ھشام نے کسی شخص کو کچھ نبطیوں کو جزیہ کی عدم ادائیگی پر بطور سزا دھوپ میں کھڑا کرتے ہوئے دیکھا تو تنکیراً فرمایا: ''یہ کیا ہے؟ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص دنیا میں لوگوں پر تشدد کرے اللہ تعالیٰ اس کو (آخرت میں) عذاب میں مبتلا کریں گے۔'' اس حدیث کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔(٢٠)

حضرت علیؓ نے اپنے ایک والیٔ خراج کی طرف لکھا: ''دیکھو جب وہاں جانا تو وصولی خراج کے سلسلہ میں نہ تو ان کا کوئی جاڑے یا گرمی کا کپڑا فروخت کرنا، نہ ان کے زیرِ استعمال غذائی اشیاء کو اور نہ ان جانوروں کو جن کے سہارے وہ محنت مزدوری کرتے ہوں، اور نہ ہی ایک درہم کی خاطر کسی کو ایک کوڑا تک مارنا، نہ کسی کو ایک پاؤں پر کھڑا کرنا، اور نہ خراج وصول کرنے کے لیے کسی کا سامان نیلام کرنا کیوں کہ ہمیں فقط اتنی اجازت دی گئی ہے کہ ان کے زائد از ضرورت اموال سے وصولی کریں، اگر تم نے میرے ان احکام کی خلاف ورزی کی تو مجھ سے پہلے اللہ تعالیٰ تم سے اس کا مواخذہ کرے گا اور اگر کسی خلاف ورزی کی اطلاع مجھ تک پہنچ گئی تو میں تم کو معزول کردوں گا۔'' اس نے جواباً عرض کیا: ''تب تو میں آپ کے پاس ویسا ہی لوٹ آؤں گا جیسا کہ جا رہا ہوں (یعنی لوگ اس وقت تک ادائیگی نہیں کرتے جب تک کچھ سختی نہ کی جائے) حضرت علیؓ نے فرمایا: ''ہاں، بے شک تم ایسے ہی لوٹ آؤ جیسے جا رہے ہو''۔(٢١)

د۔ مالی تحفظ

جسم و جان کی حفاظت کی طرح مالی تحفظ بھی ذمیوں کے حقوق میں شامل ہے اور اس بات پر بلا تفریق مسلک تمام علاقوں کے مسلمانوں کا ہمیشہ سے اتفاق رہا ہے۔امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اہل نجران کے ساتھ نبی ﷺ کے معاہدے کی درج ذیل شق ذکر کی ہے:

''نجران، وہاں کے باشندوں کے تمام افراد، انکے اہل و عیال کو اپنے اموال، جانوروں، زمینوں، مذہبی معاملات، عبادت گاہوں اور ان کے قبضہ میں کم یا زیادہ اشیاء سب کے باب میں اللہ کی نگہبانی اور محمد رسول اللہ کی ذمہ داری حاصل ہوگی۔۔۔۔'' (۲۲)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوعبیدہ بن الجراحؓ کے نام اپنے خط میں لکھا: ''مسلمانوں کو ان (ذمیوں) پر ظلم کرنے، ضرر رسانی اور انکے اموال میں نا جائز تصرف کرنے سے روکو۔'' اسی طرح حضرت علیؓ کا قول اوپر گزر چکا ہے کہ وہ لوگ جزیہ صرف اس لئے ادا کرتے ہیں کہ ان کی جانیں ہماری جانوں اور انکے اموال ہمارے اموال کی مانند محفوظ ہو جائیں ۔ مسلمان ہمیشہ اسی اصول پر کاربند رہے ہیں۔لہذا جو کوئی ذمی کا مال چرائے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور مال اصل مالک کو لوٹا دیا جائے گا۔ ذمی سے قرض لینے والے پر اس قرض کی ادائیگی واجب ہے ۔ اگر اس نے مالدار ہونے کے باوجود قرضدار کو لٹکائے رکھا تو حاکم اسے اس وقت تک قید کی سزا دے گا جب تک کہ وہ اپنا قرض ادا نہ کردے۔ اس سلسلے میں ذمیوں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں۔

اسلام غیر مسلموں کے اموال و املاک کی اس حد تک رعایت کرتا ہے کہ ان اشیاء کو بھی محترم گردانتا ہے جسے وہ لوگ اپنے دین کی رو سے مال سمجھتے ہوں اگرچہ مسلمانوں کی

نظر میں وہ ''مال'' کی تعریف پر پورا نہ اترتی ہوں۔ چنانچہ شراب اور خنزیر مسلمانوں کے نزدیک مال متقوم نہیں سمجھے جاتے لہذا اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی شراب تلف کردے یا اس کے خنزیر کو ہلاک کردے تو اس پر نہ تو کوئی جرمانہ ہے نہ اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کی جاسکتی ہے بلکہ وہ اس پر اجر وثواب کا مستحق سمجھا جائے گا کیونکہ وہ اپنے دین کے لحاظ سے اسکی نیت ایک برائی کا خاتمہ کرنا تھی جو اس پر حسب استطاعت واجب یا مستحب ہے۔ علاوہ ازیں کسی مسلمان کے لئے یہ اشیاء اپنے پاس رکھنا یا دوسروں کو فروخت کرنا جائز نہیں۔ لیکن فقہائے احناف کی تصریح کے مطابق غیر مسلم کی ملکیت میں شراب یا خنزیر اسکی نظر میں تو بہترین مال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو شخص ذمی کو ان سے محروم کرے ان کی قیمت ادا کرنے کا پابند ہے۔(۲۳)

ہ۔عزت کی حفاظت

اسلام ذمی کی عزت و کرامت کی حفاظت بالکل اسی طرح کرتا ہے جس طرح ایک مسلمان کی۔ چنانچہ ذمی کو گالی دینا، اس پر تہمت لگانا، غیبت کرنا، اس کی نسبت جھوٹی باتیں پھیلانا، اس کی شخصیت، نسب، شکل وصورت، اخلاق یا اسکے متعلق دیگر باتوں کا ناروا انداز میں ذکر کرنا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں۔ مالکی فقیہ اور ماہر اصول فقہ علامہ شہاب الدین القرافی اپنی کتاب الفروق میں لکھتے ہیں کہ ''اس امر میں کوئی شک نہیں کہ ذمیوں کے ساتھ معاہدہ ہمیں ان لوگوں کو کچھ حقوق ادا کرنے کا پابند کرتا ہے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ وہ لوگ ہمارے ہمسایہ ہیں اور ہماری حفاظت، ہماری، اللہ تعالیٰ، رسول اللہ اور دین اسلام کی ذمہ داری میں ہیں۔ لہذا ان سے زیادتی کرنا، اگرچہ وہ فقط کوئی بری بات کرنے یا غیبت سے عبارت ہی کیوں نہ ہو اللہ، اس کے رسول اور دین اسلام کی عطا کردہ ضمانت کی بے حرمتی کے مترادف ہے۔''(۲۴)

احناف کی معروف کتاب در مختار کے مطابق ''ذمی کی ایذا رسانی سے باز رہنا واجب ہے اور اس کی غیبت کرنا مسلمان کی غیبت کی مانند حرام ہے''۔ علامہ ابن عابدین اس پر یوں تبصرہ کرتے ہیں: ''(یہ بات اس لئے ہے) کہ معاہدہ ذمہ کی وجہ سے اسے وہ تمام حقوق حاصل ہو گئے ہیں جو ہمیں حاصل ہیں چنانچہ جب مسلمان کی غیبت کرنا حرام ٹھہرا تو ذمی کی غیبت کرنا بھی حرام ہوا۔ بلکہ (بعض حضرات نے یہاں تک کہا ہے کہ) ذمی پر ظلم کرنا (مسلمان پر ظلم کرنے کی نسبت) زیادہ سخت ہے''۔(۲۵)

کمزوری، مفلسی اور بڑھاپے میں مدد

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اسلام اپنے سایۂ حکومت میں موجود غیر مسلموں اور ان کے متعلقین کو مناسب زندگی کی ضمانت دیتا ہے کیونکہ وہ لوگ اسلامی ریاست کی رعایا ہیں اور ریاست پر اپنی تمام رعایا کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر نگران اپنی رعایا کی بابت جوابدہ ہے''۔(۲۶) خلفائے راشدین اور ان کے بعد آنے والے اسی پر عمل پیرا رہے۔ چنانچہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عراق کے علاقے حیرہ کے عیسائیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا اس میں مذکور تھا کہ ''میں نے انہیں یہ سہولت دے دی ہے کہ ان میں سے کام سے معذور ہو جانے والے عمر رسیدہ لوگ، مریض یا مصیبت زدہ افراد اور ماضی میں مالدار رہنے والے ایسے غریب جنہیں انکے ہم مذہب خیرات دینے لگیں جزیہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیئے جائیں گے اور انکے ذاتی مصارف اور اہل و عیال کے اخراجات مسلمانوں کے بیت المال سے ادا کئے جائیں گے''۔(۲۷) یہ واقعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں صحابہ کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی میں پیش آیا۔ حضرت خالدؓ نے ابوبکر صدیقؓ کو اس معاہدے سے تحریراً مطلع کیا۔ اس کے باوجود کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا اس قبیل کے واقعات اجماع سمجھے جاتے ہیں۔

حضرت عمر بن الخطابؓ نے ایک ضعیف العمر یہودی کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تو اس کے حالات دریافت فرمائے، جس پر انہیں معلوم ہوا کہ وہ شخص اپنے بڑھاپے اور ناداری کے باعث مانگنے پر مجبور ہوا۔ حضرت عمرؓ اس شخص کو اپنے ہمراہ خازنِ بیت المال کے پاس لے گئے اور اسے حکم دیا کہ اس شخص اور اس جیسے دوسرے افراد کا بیت المال سے اتنا وظیفہ مقرر کر دے جو ان کے لئے کافی ہو اور ان کے حالات کو درست کر دے۔ انہوں نے اس بارے میں فرمایا:

"اگر ہم ان لوگوں سے جوانی میں تو جزیہ وصول کریں اور بڑھاپے میں ان کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیں تو انصاف نہ ہوگا۔" (۲۸) شام کے علاقے جابیہ سے واپسی پر ان کا گزر جذام میں مبتلا کچھ عیسائیوں پر ہوا تو آپ نے صدقات سے انکی مدد کرنے اور ان کی خوراک کا مستقل بندوبست کرنے کا فرمان جاری کیا۔ (۲۹)

مذکورہ بالا تمام باتوں سے مسلم اور غیر مسلم افرادِ معاشرہ کو یکساں طور پر حاصل کفالتِ اجتماعی کا ایک ثبوت عام اسلامی اصول کے طور پر ملتا ہے۔ لہذا یہ بات بالکل روا نہیں کہ مسلم معاشرے میں کوئی شخص روٹی، کپڑے، مکان یا علاج کی سہولیات سے محروم رہے کیونکہ ازالہء ضرر دینی واجبات میں شامل ہے۔ کسی کے مسلم یا ذمی ہونے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

امام نووی نے المنہاج میں ذکر کیا ہے کہ اگر مسلمانوں سے ازالہء ضرر کرنا، مثلاً بے لباس کو لباس پہنانا یا بھوکے کو کھانا کھلانا، زکوۃ اور بیت المال سے ممکن نہ ہو تو اس کی حیثیت فرض کفایہ کی ہوگی۔ علامہ شمس الدین الرملی الشافعی نے کتاب نہایۃ المقام شرح المنہاج میں وضاحت کی ہے کہ اس معاملے میں اہل ذمہ بھی مسلمانوں ہی کی مانند ہیں۔ لہذا ان سے ازالہء ضرر بھی واجب ہے۔

پھر شیخ رملیؒ ''ازالہء ضرر'' کے مفہوم کی حدود متعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کیا مذکورہ بالا افراد سے نقصان دور کرنے سے مراد ضرورت کا ادنیٰ درجہ مراد ہے یا بقدر کفاف؟ اس باب میں دو آراء ہیں جن میں دوسری زیادہ صحیح ہے جس کے مطابق، مثلاً لباس کے معاملے میں ایسا لباس دینا واجب ہے جو گرمی یا سردی کے حسب حال تمام بدن کو ڈھانک دے۔ اور کھانا کھلانے اور کپڑے پہنانے کے حکم میں واضح طور پر ہر وہ چیز شامل ہے جو ان کے مفہوم میں داخل ہو مثلاً طبیب کی اجرت ادا کرنا، دواء کی قیمت یا کل وقتی خادم (کا معاوضہ ادا کرنا)۔'' علامہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ'' غلامی سے نجات دلانا بھی مسلمانوں اور ذمیوں سے ازالہء ضرر کرنے میں شمار ہوگا''۔(۳۰)

مذہبی آزادی

اسلام کی جانب سے ذمیوں کو عطا کردہ حقوق میں آزادی کا حق بھی شامل ہے۔ ذمیوں کو جو آزادیاں دی گئی ہیں ان میں سرفہرست اعتقاد وعبادات کی آزادی ہے۔ کسی بھی دین و مذہب سے تعلق رکھنے والا شخص اپنے عقیدہ پر کاربند رہ سکتا ہے اور اسے اپنا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا نہ ہی اس پر حلقہ بگوش اسلام ہونے لئے کسی طرح کا دباؤ ڈالا جاسکتا ہے۔

اس حق کی بنیاد خدا تعالیٰ کے ان ارشادات پر ہے:

﴿ دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے ﴾۔(۳۱)

اور

﴿ پھر تو کیا لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں ﴾ (۳۲)

علامہ ابن کثیر اولی الذکر آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں "اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کو دین اسلام میں داخل ہونے پر مجبور نہ کرو کیونکہ اسلام تو روزِ روشن کی طرح واضح دین ہے کیونکہ اس کے دلائل و براہین نہایت جلی ہیں اور وہ ہرگز اس بات کا محتاج نہیں کہ کسی کو مسلمان ہونے پر مجبور کیا جائے۔اس آیت کا شان نزول، جیسا کہ مفسرین نے ذکر کیا ہے، اس دین کے معجزہ ہونے کے ایک پہلو کو واضح کرتا ہے۔وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "کم نسل عورت یہ منت مان لیا کرتی کہ اگر اس کا لڑکا زندہ رہا تو وہ اسے یہودی بنادے گی (انصار کی کچھ خواتین زمانہ جاہلیت میں ایسا کیا کرتی تھیں)۔ جب بنونضیر کو جلاوطن کیا گیا ان میں بعض اولادِ انصار میں سے بھی تھے۔ ایسے بچوں کے ماں باپ کہنے لگے: 'ہم تو اپنی اولاد سے دستبردار نہیں ہوں گے (یعنی انہیں یہودیت اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیں گے' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿دین میں کوئی زور زبردستی نہیں﴾"(۳۳)

قرآن کریم نے اس کے باوجود جبر و اکراہ کی اجازت نہیں دی کہ اکراہ کی یہ کوششیں کرنے والے (کوئی اور نہیں بلکہ) وہ والدین تھے جو اپنے بچوں کو مخالفینِ دین وملت اور اپنے خلاف آمادۂ جنگ دشمنوں کی پیروی سے روکنا چاہتے تھے۔ قرآن نے ان خاص حالات سے صرفِ نظر کیا جن میں ان لوگوں کے بچے عہدِ طفولیت میں یہودی ہوئے تھے۔ حالانکہ دینی اختلاف تو ایک طرف فقط مسلکی اختلاف رکھنے والوں کے خلاف بھی اس وقت ساری دنیا میں ظلم وتشدد کی لہریں اٹھ رہی تھیں، جیسا کہ سلطنتِ روما کا دستور تھا جو مختلف ادقات میں اپنی رعایا کو نصرانیت یا موت میں سے ایک چیز قبول کرنے پر مجبور کرتی رہی اور ملکانی مذہب قبول کرنے کے بعد تو اس نے قبولِ مسیحیت سے انکاری ہر شخص (مثلاً یعقوبی فرقہ کے پیروکاروں اور دوسروں) کو سزا دینے کے لئے ذبح خانے قائم

کر دیئے۔

قرآن میں اکراہ کی ممانعت اس لئے ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت سے نوازے اور اس کا سینہ کھول کر بصیرت سے منور کرے وہ دلیلِ روشن کی بنیاد پر مشرف بہ اسلام ہو جاتا ہے، اور جس شخص کے دل کو خدا بصیرت سے محروم کر دے، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دے ایسے شخص کا اسلام میں مجبوراً داخل ہونا، بقول علامہ ابن کثیر، چنداں مفید نہیں۔ یہ اس لیے بھی ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک "ایمان" زبان سے کہے گئے الفاظ یا اعضائے بدن سے کی جانے والی عبادات کا نام نہیں بلکہ اس کی بنیاد اقرار اور یقین و تسلیمِ قلبی پر ہے۔ چنانچہ مغربی مورخین اعتراف کرتے ہیں کہ تاریخ میں ذمیوں کو قبولِ اسلام پر مجبور کرنے والے مسلمانوں کی کوئی مثال موجود نہیں۔

اسلام نے ہمیشہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی اور ان کے مذہبی شعائر کا خیال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ قرآن نے جن اسباب کی بنا پر قتال کی اجازت دی ان میں آزادیٔ عبادت کی حفاظت کو بھی شامل کیا ہے جیسا کہ درج ذیل ارشاد باری تعالیٰ میں مذکور ہے:

﴿ اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے 'ہمارا رب اللہ ہے۔' اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجے اور معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کر ڈالی جائیں ﴾ (۴۴)

قبل ازیں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اہل نجران کے ساتھ نبی ﷺ کے معاہدے میں کہا گیا تھا کہ: ''ان کے واسطے اللہ کی ہمسائیگی اور ان کے اموال، دین اور کاروبار رسول اللہ کی ذمہ داری میں ہیں''۔ اہل ایلیاء (القدس) کے ساتھ حضرت عمرؓ کے معاہدے میں ان کی مذہبی آزادی، عبادت گاہوں اور شعائر کی آزادی پر باقاعدہ شق موجود ہے: ''اللہ کے بندے عمر امیر المومنین نے اہل اہلیا کو ان کی جانوں اور مالوں کی پناہ دی۔ ان کے گرجا، صلیبیں اور تمام مذاہب کے لوگ پناہ میں رہیں گے۔ ان کے گرجاؤں میں نہ تو کوئی رہائش پذیر ہوگا اور نہ وہ گرائے جائیں گے اور ان کی عمارت سے کچھ بھی توڑا نہ جائے گا اور نہ ان کی صلیب یا کسی مال کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ ان کے مذہب کے معاملے میں ان پر کوئی زبردستی نہیں کی جائے گی اور نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔'' یہ الفاظ طبری کے ہیں۔(۳۵)

اہل عانات کے ساتھ خالد بن الولیدؓ کے معاہدے میں مذکور تھا کہ ''اوقاتِ نماز کے سوا روز و شب کے جس حصے میں وہ چاہیں اپنے ناقوس بجاسکتے اور اپنے ایامِ عید میں صلیب برآمد کرسکتے ہیں۔''(۳۶)

اسلام غیر مسلموں سے صرف اس قدر مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے احساسات اور ان کی حرمات کا خیال رکھیں۔ اس لئے اپنے مذہبی شعائر اور صلیبوں کا ممالک اسلامیہ میں مظاہرہ نہ کریں اور کسی ایسے شہر میں جہاں پہلے گرجا گھر موجود نہ ہو نئے گرجا تعمیر نہ کریں مبادا کہ مسلمانوں کے احساسات و جذبات سے بے پروائی کا تاثر پیدا ہو ہم کچھ مسلم فقہاء نے اسلامی ممالک اور جن علاقوں کو مسلمانوں نے بزور شمشیر فتح کیا ہو (یعنی وہاں کے باشندوں نے مسلمانوں سے جنگ ہار کر سر تسلیم خم کیا ہو) وہاں کے ذمیوں کو گرجے اور دوسری عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی اس وقت اجازت دی ہے جب بر بنائے

مصلحت مسلمانوں کا حاکم اجازت دے۔ اسلام انہیں اپنے عقائد کی پیروی کرتے رہنے کی اجازت دیتا ہے اور ان سے تعرض نہیں کرتا۔ زیدیہ اور امام مالک کے ایک شاگرد امام ابن القاسم نے یہی رائے اختیار کی ہے۔(۳۷)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور سے یہی عمل رہا ہے کیونکہ پہلی صدی ہجری میں مصر میں کئی گرجا گھر تعمیر کئے گئے، مثلاً اسکندریہ کا گرجا ''مار مرقس'' جو ۳۹ سے ۵۶ ہجری کے درمیان تعمیر کیا گیا۔ اسی طرح روم کا پہلا گرجا فسطاط میں مسلمہ بن مخلد کی حکومتِ مصر میں ۴۷ھ سے ۶۸ھ کے درمیان تعمیر کیا گیا۔ اور عبدالعزیز بن مروان نے جب حلوان کا شہر آباد کیا تو اس میں گرجا تعمیر کرنے کی اجازت دی۔ اس کے علاوہ انھوں نے کچھ راہبوں کو مزید خانقاہیں تعمیر کرنے کی بھی اجازت دی۔ ایسی ہی اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مورخ المقریزی نے اپنی کتاب الخطط میں کئی مثالیں بیان کرنے کے بعد ان الفاظ پر بیان کا اختتام کیا ہے: '' اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ قاہرہ کے مذکورہ تمام گرجے اسلامی دور میں تعمیر کیے گئے''۔(۳۸)

جہاں تک دیہات اور ایسے علاقوں کا تعلق ہے جو مسلم علاقے شمار نہیں ہوتے تو وہاں پر ذمیوں کو دینی شعائر کا اظہار کرنے، پرانے گرجا گھروں کی مرمت اور آبادی میں اضافے کے پیش نظر ضروری تعمیرات سے روکا نہیں جائے گا۔

ایک مختلف دین سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ یہ روادارانہ سلوک اس قوم کا ہے جس کی تمام زندگی کا دارومدار دین پر تھا اور جس کے غلبے کا باعث دین ہی رہا تھا اور اس امر کی تاریخ ادیان میں کوئی مثال نہیں، جیسا کہ خود اہل مغرب نے شہادت دیتے ہیں:

مشہور فرانسیسی دانشور گستاف لوبوں کا کہنا ہے، ''جن قرآنی آیات کا ہم نے ابھی

ذکر کیا ان میں ہم دیکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہود ونصاریٰ کے ساتھ رواداری کس درجہ عظیم الشان تھی اور ان سے پہلے ظاہر ہونے والے ادیان خصوصاً یہودیت ونصرانیت کے بانی اس طرح کی رواداری کے قائل نہ تھے"۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ محمدؐ کے خلفاء کس طرح ان کے طریقے پر عمل پیرا رہے۔ اس رواداری پر مبنی رویے کا اعتراف یورپ سے تعلق رکھنے والے کچھ شک میں مبتلا علماء نے کیا ہے اور بہت کم ایسے مذہبی افراد نے بھی جن کی تاریخ عرب پر گہری نظر ہے۔ آئندہ صفحات میں دیے گئے اقتباسات سے جو کہ میں ایسے متعدد علماء کی کتابوں سے منتخب کر کے پیش کر رہا ہوں یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس باب میں ہماری رائے منفرد نہیں۔ روبرٹسن نے اپنی کتاب "تاریخ چارلس پنجم" میں لکھا ہے: "مسلمان ہی وہ قوم ہیں جنہوں نے بیک وقت اپنی غیرت دینی کو بھی برقرار رکھا اور دوسرے ادیان کے پیروؤں کے ساتھ رواداری کی روح کو فروغ بھی دیا اور انہوں اپنے دین کی اشاعت کے لئے تلوار نکالنے کے باوجود اسلام میں رغبت نہ رکھنے والوں کو اپنی دینی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی بالکل آزادی دے دی"۔(۳۹)

آزادیٔ کسب ومعاش

غیر مسلموں کو دوسروں کے ساتھ تجارتی معاہدوں وغیرہ کے ذریعے کاروبار کرنے اور روپیہ کمانے کی آزادی دی گئی ہے۔ چنانچہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ خرید وفروخت، تجارت، ہر طرح کے معاہدوں اور مالی معاملات میں ذمی مسلمانوں ہی کی مانند ہیں۔ فقط سودی لین دین اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ ان پر بھی مسلمانوں ہی کی طرح حرام ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے ہجر کے مجوسیوں کو لکھا: "یا تو تم لوگ سود چھوڑ دو یا اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ!"

اسی طرح ذمیوں کو مسلم ممالک میں شراب اور خنزیر فروخت کرنے، شراب خانے

کھولنے، شراب نوشی کو ترویج دینے یا اسے کھلم کھلا مسلم علاقوں میں درآمد کرنے کی اجازت نہیں اگرچہ وہ ایسا اپنے ذاتی استعمال کے لئے ہی کیوں نہ کرنا چاہیں ۔ یہ ممانعت فتنہ و فساد کے سدباب کی خاطر کی گئی ہے۔

ان چند امور کے علاوہ ذمیوں کو تجارت اور صنعت و حرفت میں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ مسلمانوں کے ہاں اس پر عمل بھی کیا جاتا رہا اوران کی تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کا اظہار بھی ہوتا رہا۔ البتہ بعض پیشے غیر مسلموں کے ساتھ تقریباً خاص ہو گئے مثلاً صرافہ اور دوا سازی وغیرہ۔ بہت سے اسلامی ممالک میں ماضی قریب تک یہی حال رہا۔ ان پیشوں سے ان لوگوں نے جزیہ کے سوا ہر ٹیکس اور زکوۃ سے مستثنیٰ بے شمار دولت اکٹھی کی۔ جہاں تک جزیہ کا تعلق ہے تو وہ اسلحہ اٹھا سکنے کے قابل لوگوں پر ایک نہایت معمولی شرح کا ٹیکس ہے۔

ایڈم متز نے لکھا ہے: ''ایسا کوئی پیشہ نہیں جسے اختیار کرنا ذمیوں کے لیے شریعتِ اسلامیہ میں ممنوع قرار دیا گیا ہو۔ تمام منافع بخش حرفتوں میں ان لوگوں نے قدم خوب جما رکھے تھے چنانچہ ان میں کئی زرگر، تاجر اور اطباء تھے۔ ذمیوں نے تو خود کو اس انداز سے منظم کر رکھا تھا کہ شام کے اکثر بڑے زرگر یہودی تھے جبکہ طبیب اور کاتب اکثر نصرانی تھے۔ بغداد کے نصرانیوں کا سردار خلیفہ کا طبیب خاص تھا اور یہودیوں کے بڑے اور سردار بھی اس کے پاس ہوا کرتے تھے''۔(۴۰)

سرکاری عہدوں کی تولیت

ذمیوں کو مسلمانوں کی مانند ہر سرکاری عہدہ سنبھالنے کا حق حاصل ہے باستثناء ایسے عہدوں کے جن پر دینی رنگ غالب ہو مثلاً امامت، سربراہی سلطنت، سپہ سالاری،

مسلمانوں کے درمیان قضاء اور صدقات کی تقسیم وغیرہ

اسی طرح امامت یا خلافت دین و دنیا میں عمومی سربراہی اور رسول اللہ ﷺ کی نیابت ہے اور نبی ﷺ کی خلافت ایک غیر مسلم کو ملنا کسی طرح بھی روا نہیں، نہ ہی کسی غیر مسلم کے لیے اسلامی احکام کو نافذ کرنا اور ان کا خیال رکھنا ممکن ہے۔ فوج کی قیادت بھی کوئی عام بات نہیں بلکہ اعمالِ عبادت میں سے ہے کیونکہ جہاد کا شمار افضل ترین اسلامی عبادات میں ہوتا ہے۔ قضاء سے مراد شریعت اسلامی کے مطابق فیصلے کرنا ہے اور ایک غیر مسلم سے یہ مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک ایسی چیز کے مطابق فیصلہ کرے جس پر اس کا ایمان ہی نہیں۔ یہی مثال صدقات پر اختیار اور دیگر دینی امور کی ہے۔

ان مستثنیات کے علاوہ دوسرے سرکاری وظائف ذمیوں کے سپرد کیے جا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ قابلیت، امانت داری، اور ریاست سے وفاداری جیسی ضروری شرائط پر پورا اترتے ہوں اور ان کینہ پرور لوگوں میں سے نہ ہوں جن کی مسلمانوں سے پکی دشمنی ثابت ہو چکی ہو اور جو درجِ ذیل فرمانِ باری تعالیٰ کے مصداق ہوتے ہیں:

﴿اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے۔ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم نے تمھیں صاف صاف ہدایات دے دی ہیں، اگر تم عقل رکھتے ہو (تو ان سے تعلق رکھنے میں احتیاط برتو گے۔﴾ (۴۱)

مسلمان جس حد تک روادار تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ فقہاء۔

مثلاً الماوردی کی الاحکام السلطانیہ میں تصریح، کے مطابق ایک ذمی کو وزارت تنفیذ تک دی جا سکتی ہے۔ وزیرِ تنفیذ حاکم کے احکام کو متعلقہ افراد تک پہنچا کر انہیں عملی جامہ پہناتا اور انہیں نافذ کرتا تھا۔ اس برخلاف وزارت تفویض ایک ایسا شعبہ تھا جس میں حاکم سیاسی ،اداری اور معاشی امور وزیر کے سپرد کر دیتا تھا کہ وہ انہیں اپنی رائے کے موافق چلائے۔

عباسیوں کے زمانے میں بعض عیسائی متعدد بار عہدہ وزارت پر براجمان ہوئے مثلاً نصر بن ہارون (۳۶۹ھ) اور عیسی بن نسطورس (۳۸۰ھ) میں وزیر بنا۔ اس سے پہلے معاویہ بن ابی سفیان کا ایک عیسائی کاتب تھا جس کا نام سرجون تھا۔

اس بارے میں مسلمانوں کی رواداری بعض اوقات دوسرے مسلمانوں کی حق تلفی کی حدود کو چھونے لگتی اور مسلمان عوام کبھی کبھار یہود و نصاریٰ کے خود پر بلاجواز تسلط سے شاکی بھی ہوئے۔ مغربی مورخ ایڈم میتز نے اپنی کتاب الحضارۃ الاسلامیۃ فی القرن الرابع الھجری میں لکھا ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم عہدیداروں اور ذمہ دار افراد کی اکثریت سے تعجب ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلامی ممالک میں عیسائی مسلمانوں کے درمیان فیصلے کرتے ہیں جبکہ اہل ذمہ کی تحکیم کے خلاف مسلمانوں کی شکایت بہت پرانی بات ہے۔(۴۲)

ایک مصری شاعر اپنے زمانے کے حکام کے ہاں یہودیوں کے اثر درسوخ کے بارے میں کہتا ہے:

''اس زمانے کے یہودی اپنی خواہشات کی حدود کو پا چکے ہیں

وہ لوگ مالک بن بیٹھے ہیں۔

بزرگی ان میں ہے مال و دولت ان کے پاس ہے،

مشیر اور بادشاہ ان ہی میں سے ہیں

اے اہل مصر میں تو تمہیں نصیحت کرنے کا حق ادا کر چکا

میری مانو تو یہودی ہو جاؤ کیونکہ آسمان بھی یہودی ہو گیا ہے۔'' (۴۳)

مشہور حنفی فقیہ ابنِ عابدین نے یہ دکھانے کے لیے کہ انکے زمانے کے غیر مسلم مسلمانوں پر اس حد تک جری ہو گئے کہ انکے فقہا تک پر حکم چلانے لگے تھے، ایک اور شاعر کا درجِ ذیل کلام ذکر کیا ہے

شاعر کہتا ہے

اے دوستو! زمانے کی مصیبتیں تو بے شمار ہیں،

مگر تلخ ترین مصیبت بلند مراتب پر احمقوں کا فائز ہو جانا ہے

زمانہ آخر اپنی مدہوشی سے کب بیدار ہو گا

کہ میں یہودیوں کو فقہائے اسلام کی ذلت کے درپے دیکھتا ہوں! (۴۴)

یہ سب جہالت، انحراف اور گراوٹ کے زمانے میں اسلامی معاشرے کو لاحق ہو جانے والے زوال کا اثر تھا کہ نوبت یہودیوں کی عزت (تعظیم) اور فقہاء کی ذلت تک جا پہنچی۔ تاریخ میں ایسی آخری مثال ہمیں خلافت عثمانیہ کے آخری ادوار میں ملتی ہے جب سلطنت نے اپنی اکثر اہم اور حساس ذمہ داریاں غیر مسلم افرادِ رعایا کے سپرد کر رکھی تھیں بلکہ غیر ممالک میں اپنے اکثر سفیر اور نمائندے تک عیسائیوں میں سے مقرر کیے تھے۔

اقباطِ مصر کے متعلق نبی ﷺ کی ہدایات

مصر کے اقباط کا تو ایک خاص معاملہ اور الگ مقام ہے کیونکہ ان کے متعلق نبی ﷺ نے بطورِ خاص وصیت فرمائی ہے جسے ہر مسلم کا ذہن اچھی طرح یاد اور دل عزیز رکھتا ہے۔

چنانچہ ام المومنین سلمہ رضی اللہ عنھا سے روایت ہے کہ اپنے وصال کے قریب نبیؐ نے وصیت کرتے ہوئے فرمایا: ''اقباط مصر کے بارے میں اللہ سے ڈرنا کیونکہ تم (عنقریب) ان پر غلبہ پاؤ گے اور وہ اللہ کی راہ میں تمہارے اعوان و انصار بنیں گے''۔(۴۵) ایک اور حدیث میں حضرت ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن یزید الحبلی اور عمرو بن حریث سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ''انکے ساتھ خیر خواہی پر مبنی سلوک کرو۔ کیونکہ یہ لوگ (یعنی اقباط مصر) تمہاری طاقت اور اللہ کے حکم سے دشمن تک تمھاری رسائی کا ذریعہ ہیں''۔(۴۶)

جس بات کی نبیؐ نے خبر دی تھی بعد میں تاریخی حقائق نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ چنانچہ قبطیوں نے نہ صرف مسلم فاتحین کو خوش آمدید کہا بلکہ اپنے رومی حکمرانوں کے ہم مذہب عیسائی ہونے کے باوجود مسلمانوں کے لئے دل کھول دیئے۔ قبطی اللہ کے دین میں یوں فوج در فوج داخل ہوئے کہ بعض اموی حکام نے نومسلموں سے بھی جزیہ وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح افریقہ میں مصر اسلام کا دروازہ ثابت ہوا اور اس کے باشندے اللہ کی راہ میں مددگار بن گئے۔

ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ''عنقریب تم ایک علاقہ فتح کرو گے اور وہاں ''قیراط'' کا نام سنو گے۔ وہاں کے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا کیونکہ وہ تمھاری ذمہ داری ہیں اور حق قرابت داری کے حامل ہیں''۔ ایک روایت میں ہے

کہ ''عنقریب تم مصر فتح کرو گے۔ یہ ایسا ملک ہے جس میں قیراط (۴۷) کا ذکر کیا جاتا ہے جب تم اسے فتح کرو تو وہاں کے باشندوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا کیونکہ ان کے پاس ذمہ اور قرابت داری ہے یا یوں کہا'' ذمہ اور سسرالی تعلق''۔(۴۸)

علماء کا کہنا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو قرابت داری ہے وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ہاجرہ کا ان میں سے ہونا ہے۔ سسرالی تعلق سے مراد نبیؐ کے صاحبزادے ابراہیم کی والدہ ماریہ کا ان میں سے ہونا ہے۔(۴۹) یہ بات تعجب انگیز نہیں کہ امام نودی نے اپنی کتاب ریاض الصالحین کے باب ''والدین کے ساتھ نیکی اور صلۂ رحم کرو'' میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے جس میں مسلمانوں اور اہل مصر کے درمیان ان کے اسلام لانے سے قبل بھی اس صلۂ رحمی کی طرف اشارہ ہے جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا۔ کعب بن مالک انصاری سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے (جب مصر فتح ہو جائے تو قبطیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا کیونکہ وہ خونی رشتہ اور قرابت داری رکھتے ہیں'' ایک روایت میں یوں آیا ہے: ''وہ ذمہ اور قرابت داری رکھتے ہیں''، یعنی حضرت اسماعیل کی والدہ ان میں سے ہیں۔(۵۰)

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قبطیوں کو دوسروں سے زیادہ حقوق دیے ہیں، چنانچہ وہ لوگ ذمہ کے حامل ہیں یعنی اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کا وعدہ، جو اس قابل ہے کہ اس کی پابندی اور حفاظت کی جانی چاہیے۔ اس کے علاوہ وہ لوگ ہمارے ساتھ ایسی قرابت اور خونی رشتہ داری رکھتے ہیں جو دوسروں کے ساتھ نہیں۔ چنانچہ ماریہ قبطیہ جن کے بطن سے آنحضرتؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم تولد ہوئے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام یعنی عرب مستعربہ کے مورثِ اعلیٰ کی والدہ ان میں سے تھیں۔

مذکورہ حقوق کے تحفظ کی ضمانتیں

شریعت اسلامی نے غیر مسلم شہریوں کو مذکورہ بالا سب حقوق اور آزادیاں دی ہیں اوران سے حسنِ معاشرت اور حسنِ معاملہ کی تاکید بھی کی ہے۔ لیکن ان حقوق کی عملاً ادائیگی اور ان تعلیمات پرعمل کی کیا ضمانت ہے جبکہ دینی اختلاف ایک ممکنہ رکاوٹ کی حیثیت رکھتا ہے؟ یہ اعتراض ان دنیاوی دساتیر اور لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین کے متعلق تو درست ہے جو شہریوں کے مابین مساواتِ حقوق وفرائض کی تصریح کردینے کے باوجود کاغذ پر لکھے حروف سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے کہ ان قوانین کے تقدس کا شعور اور ان کی اطاعت وحکمرانی پر ایمان نہ رکھنے کے باعث عوام پر خواہشات اور تعصبات ہی غالب رہتے ہیں اور قوانین ان پر غلبہ نہیں پا سکتے۔ اسلام البتہ الٰہی شریعت اور آسمانی قانون ہے جس کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، جس کا کوئی حکم ظلم پر مبنی نہیں ہوسکتا اور جس کی اطاعت پر راضی ہوئے بغیر نہ ہی ایمان مکمل ہوسکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

﴿کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اسکا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کردے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔﴾(۵۱)

۱۔ عقیدے کی ضمانت

اللہ کے اس فرمان کی روشنی میں اپنے دین پر کاربند ہر مسلمان اپنے رب کی رضا اورثواب کے حصول کی خاطر اس کی شریعت کے احکام اور ہدایات پرعمل پیرا ہونے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ ایسا کرنے سے اسے نہ تو محبت وقرابت کے جذبات روکتے ہیں اور نہ ہی بغض وعداوت کے احساسات ۔ ارشاد باری ہے:

﴿اے لوگو جو ایمان لائے ہو! انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔﴾ (۵۲)

اللہ سبحانہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے﴾ (۵۳)

ب۔ مسلم معاشرے کی ضمانت

شریعت کے نفاذ کو یقینی بنانا اور تمام امور اس کے قوانین کی روشنی میں طے کرنا اسلامی معاشرے کی ذمہ داری ہے اور ان ہی قوانین میں غیر مسلموں سے متعلق قوانین بھی شامل ہیں۔ لہذا جب بھی کوئی کسی کوتاہی، انحراف، ظلم یا زیادتی کا ارتکاب کرے تو معاشرے میں اسے راہِ حق کی طرف لوٹا دینے، بھلائی کا حکم دینے، برائی سے روکنے اور زیادتی کے شکار مظلوم کا ساتھ دینے والے کچھ افراد ضرور موجود ہونگے، اگرچہ مظلوم کا تعلق کسی دوسرے دین سے ہی کیوں نہ ہو۔ بعض اوقات یہ سب ذمی کی شکایت کے بغیر ہی ہوجاتا ہے اور کبھی کبھار ہی اسے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی شکایت کرنا پڑتی ہے۔ اسے فریاد سننے والا اور اپنے دنیاوی اور اجتماعی مقام و مرتبے سے قطع نظر انصاف کرے والا ضرور کوئی مل جاتا ہے۔

مظلوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ والی یا مقامی حاکم کے پاس شکایت لے جاکرانصاف و دادرسی حاصل کرے۔ اگر والی اس کی مدد نہ کرے تو وہ اس سے بالا کسی ذمہ دارشخص مثلاً خلیفہ کے پاس جا سکتا ہے، خواہ اسکا دعوی خود خلیفہ ہی پر ہو کیونکہ اسے ایسی آزاد اور منصف عدلیہ کی ضمانت حاصل ہے جو کسی مدعا علیہ ،حتی کہ خلیفۂ وقت کا محاکمہ کرسکتی ہے۔ ایک اور ضمانت ان فقہاء کے ہاں موجود ہے جو شریعت کے محافظ اور رائے عامہ کوسمت دینے والے ہیں۔

ان ضمانتوں میں سب سے بڑی اور جامع ضمانت بہر حال اسلامی عقیدے، تربیت، رسوم ورداج اور روایات سے تشکیل پانے والا اسلام کا اجتماعی ضمیر خود فراہم کرتا ہے۔ تاریخ اسلام ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جن سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ ذمیوں کو ہر اس زیادتی سے بچانے کا کس قدر اہتمام کرتا ہے جس سے ان کو دیئے گئے حقوق، عصمتوں اور آزادیوں پر زد پڑتی ہو۔ لہذا جب بھی کوئی ذمی کسی مسلمان کے ظلم کا شکار ہوا حاکمِ علاقہ نے شکایت یا ذاتی معلومات کی بنا پر فوری طور پر ظلم کا ازالہ کرتے ہوئے اسے انصاف فراہم کیا۔

چنانچہ ایک راہب نے مصر کے گورنر احمد بن طولون سے شکایت کی کہ اسکے ایک سپاہی نے ظلم سے اسکا مال ہتھیالیا ہے۔ ابن طولون نے سپاہی کوتنبیہ کرنے اور مال واپس لے کر عیسائی کو لوٹا دینے کے بعد شکایت کنندہ سے کہا: ''اگر تم نے اس شخص کے خلاف موجودہ رقم سے کئی گنا زیادہ کا مطالبہ بھی کیا ہوتا تو میں اسے لوٹانے پر مجبور کرتا''۔ ابنِ طولون نے پھر ہر مظلوم ذمی کے لئے اپنے دروازے کھول دیے اگرچہ اس کے دعوے کسی بڑے سے بڑے رہنما یا سرکاری افسر کے خلاف ہی کیوں نہ تھے۔

اور اگر ظلم کرنے والا خود گورنر یا اس کا کوئی حاشیہ بردار ہوتو اسکی سرزنش کر کے حقدار

کو اس کا حق دلانا مسلمانوں کے امام اور خلیفہ کی ذمہ داری ہے۔

اس کی مشہور ترین مثال مصر کے حاکم عمرو بن العاص اور ایک قبطی کا واقعہ ہے۔ ان کے صاحبزادے نے ایک قبطی کے بیٹے کو کوڑا مار کر کہا:" میں تو شریف زادہ ہوں!" قبطی شکایت لے کر امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس مدینہ جا پہنچا۔ خلیفہ نے عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے کو طلب کیا اور قبطی کے بیٹے کو کوڑا تھماتے ہوئے کہا "مارو شریف زادے کو!" جب وہ اپنا بدلہ لے چکا تو حضرت عمر اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے "ایک کوڑا عمرو کے سر پر بھی رسید کر دو کیونکہ انہی کی طاقت کے زعم میں تمہیں ان کے بیٹے نے مارا ہے۔" اس پر قبطی نے جواب دیا،" جس نے مجھے مارا میں اس سے بدلہ لے چکا۔" پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمرو سے مخاطب ہو کر اپنا شہرۂ آفاق جملہ ارشاد فرمایا:" اے عمرو تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا؟۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا"۔

اس واقعے میں قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اسلام کے سائے میں لوگوں کو اپنی عزت اور شرفِ انسانی کا بھرپور احساس تھا حتیٰ کہ اگر کسی کے ایک طمانچہ بھی ناحق رسید کیا جاتا تو اسے برداشت نہ کرتا جبکہ اس جیسے ہزاروں واقعات رومیوں وغیرہ کے عہد میں پیش آتے اور کسی کو سر اٹھانے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ لیکن اسلامی ریاست کے زیرِ سایہ ہر فرد کو اپنی عزت اور حقوق کا شعور اس قدر تھا کہ ایک مظلوم مصر سے مدینہ تک کے طویل سفر کی سختیاں اس اعتماد پر جھیل لیتا تھا کہ اس کا حق ہرگز ضائع نہ جائے گا اور اس کی فریاد توجہ سے سنی جائے گی۔

اور اگر ظلم کا معاملہ خلیفہ تک نہ پہنچ پائے یا خلیفہ خود بھی اپنے حکام ہی کی طرح (ظالم) ہو تو مسلم رائے عامہ، جس کی نمائندگی مسلم فقہاء اور تمام متدین لوگ کرتے ہیں، مظلوم کا ساتھ دینے کو موجود ہے۔ اس کی ایک نہایت واضح مثال ہمیں امام اوزاعی

کے موقف میں ملتی ہے: ایک عباسی حاکم نے کچھ غیر مسلم افراد کی عامل خراج کے خلاف بغاوت کی پاداش میں سب ذمیوں کو جبل لبنان سے جلا وطن کر دیا۔ یہ عباسی حاکم یعنی صالح بن علی بن عبداللہ بن عباس خلیفہ کا قرابت دار بھی تھا۔ امام اوزاعی نے اپنے ایک طویل مراسلے میں اسے لکھا ''تم چندلوگوں کے جرم پر تمام عوام کو کیسے سزا دے سکتے ہو کہ وہ اپنے گھر بار سے نکالے جاتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان تو یہ ہے: ﴿یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا﴾(۵۴)، یہ بات سب سے زیادہ وقوف وتسلیم کی مستحق ہے اور پاسداری اور اہتمام کی سب سے زیادہ حقدار ہدایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے کیونکہ انہوں نے فرمایا ہے:'' ذمی پر ظلم کرنے یا اس پر اسکی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے والے سے میں منازعت کروں گا۔'' یہاں تک کہ انھوں نے اپنا مراسلہ ان الفاظ پر ختم کیا کہ'' یہ لوگ غلام نہیں کہ تمھارے لئے ان کو ایک علاقے سے دوسرے علاقے بھیج دینا حلال ہوتا بلکہ وہ تو آزاد ذمی ہیں۔''(۵۵)

مسلم تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ذمیوں پر لمبے عرصے تک ظلم جاری رہا ہو، کیونکہ رائے عامہ، جس کا فقہاء ہمیشہ ساتھ دیتے رہے، ظالموں اور راہِ حق سے انحراف کرنے والوں کے خلاف کھڑی ہو جایا کرتی اور حق فوری طور پر حقدار کو ادا کر دیا جاتا۔

خلیفہ ولید بن عبدالملک نے یوحنا کا کلیسا عیسائیوں سے چھین کر مسجد میں شامل کر دیا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ بنے تو عیسائیوں نے اپنے کلیسا کے ساتھ ولید کے سلوک کی شکایت کی، جس پر انہوں نے اپنے عامل کو لکھا کہ اگر عیسائی قیمت لینا قبول نہ کریں تو مسجد میں شامل کیا گیا قطعہء زمین انھیں واپس کر دیا جائے''۔(۵۶)

اور جب رومی حملے کے خوف سے ولید بن یزید نے قبرص کے ذمیوں کو شام جلاوطن کیا تو فقہاء اور تمام مسلمان اس پر ناراض ہوئے اور اسے بہت برا سمجھا حالانکہ یہ کام اس

نے ریاست کی حفاظت کے نقطہ نظر سے اور احتیاطاً کیا تھا۔ اور جب یزید بن ولید کا دور آیا اور اس نے انہیں قبرص واپس بھجوایا تو مسلمانوں نے اس کی تحسین کی اور اس قدم کو اس کے عدل کی علامت سمجھتے ہوئے اس کے مناقب میں شمار کیا، جیسا کہ مورخ بلاذری نے روایت کیا ہے۔(۵۷)

عدلیہ کو دی جانے والی طاقت اور آزادی اسلامی نظام کے محاسن و مفاخر میں سے ایک ہے۔ لہذا اسلام کے فراخدلانہ اور مبنی برحق نظامِ عدالت میں تمام مظلوموں اور زیادتی کے شکار لوگوں کو خواہ وہ کسی بھی مذہب یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں اس بات کی ضمانت حاصل تھی کہ ظالم سے انصاف اور غاصب سے انکا حق دلایا جائے گا اگرچہ ظالم اپنی تمام تر ہیبت وقوت سمیت خود خلیفہ ہی کیوں نہ ہو۔

تاریخِ اسلام میں سلطان یا خلیفہ کے قاضی کی عدالت میں بطور مدعی یا مدعا علیہ پیش ہونے کی بھی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ ایسے بہت سے واقعات میں فیصلہ خلیفہ یا سلطان کے خلاف اور طاقت اور اثر ورسوخ سے محروم کسی عام فرد کے حق میں کیا گیا۔ یہاں ہم صرف ایک ایسی مثال کا ذکر کافی سمجھتے ہیں جو ہمارے دعوی کا نہایت واضح ثبوت ہے:

ایک مرتبہ امیر المومنین علیؓ بن ابی طالب کی زرہ گر پڑی اور بعد میں ایک نصرانی کے پاس نظر آئی۔ اس شخص نے زرہ کا مالک ہونے کا دعویٰ کیا دونوں اپنا مقدمہ لے کر قاضی شریح کے سامنے پیش ہوئے۔ علیؓ نے کہا یہ زرہ میری ہے جو نہ تو میں نے فروخت کی ہے اور نہ کسی کو تحفتاً دی ہے۔ قاضی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیان پر عیسائی کا موقف دریافت کیا تو وہ کہنے لگا کہ یہ زرہ تو میری ہے، البتہ امیر المومنین کو میں جھوٹا نہیں سمجھتا“۔

اس پر قاضی شریح علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور دریافت کیا: ”اے امیر المومنین کیا آپ

کے پاس اپنے دعوے کا کوئی ثبوت ہے؟ حضرت علی ہنس دیئے اور فرمایا: ''شریح حقیقت تک پہنچ گئے! میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔'' لہٰذا شریح نے زرہ نصرانی کو دیئے جانے کا فیصلہ سنا دیا کیونکہ اس پر قبضہ اسی کا تھا اور اس کے خلاف علیؓ کوئی ثبوت مہیا نہ کر سکے۔ وہ شخص زرہ لے کر چلنے لگا مگر پھر کچھ قدم اٹھانے کے بعد پلٹا اور کہنے لگا میں شہادت دیتا ہوں کہ یہ احکام انبیاء کے ہیں۔ امیر المومنین مجھے فیصلے کے لئے اپنے قاضی کے پاس لے جاتے ہیں اور وہ ان کے خلاف میرے حق میں فیصلہ سنا دیتا ہے!۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ یہ زرہ بے شک، اے امیر المومنین آپ کی ہے، آپ صفین سے نکل کر لشکر کا پیچھا کر رہے تھے کہ یہ آپ کے خاکستری اونٹ سے نکل کر گر گئی۔ حضرت علیؓ نے اس سے کہا ''جب تم نے اسلام قبول کر لیا تو پھر یہ تمہاری ہوئی!'' (۵۸) یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مصطفیٰ السیوطی الرحیبانی، مطالب أولی النهی، (بیروت: المکتب الإسلامی ،۱۹۶۱ء) جلد۲، ص،۶۰۲ سے ۶۰۳۔

۲۔ شہاب الدین احمد بن ادریس القرافی، الفروق، (بیروت: موسسة الرسالة ،۲۰۰۸ء) ج ۲ ،ص ۴۳۱، فرق نمبر۱۱۹۔

۳۔ حوالہء سابق ،ص ۴۳۲۔

۴۔ روایتِ ابو داؤد، السنن ،کتاب الخراج، باب تعشیر أهل الذمة'' وبیہقی۔ دیکھئے: السنن الکبریٰ، باب ''لا یأخذ المسلمون من ثمار أهل الذمة۔۔۔الخ جلد۵،ص، ۲۰۵۔

۵۔ اسے خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں سندِ حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔

۶۔ اسے طبرانی نے المعجم الأوسط میں سندِ حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔

۷۔ بروایتِ امام ابو یوسف، کتاب الخراج ،ص ،۷۲ سے ۷۳۔

۸۔ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری، تاریخ الأمم والرسلو الملوك (بیروت: دار الکتب العلمیة، ۱۹۸۷ء) ج ۲، ص ۵۰۳۔

۹۔ موفق الدین ابن قدامہ، المغنی ، ج ۱۳، ص ۱۳۵۔

۱۰۔ یہ بات ابنِ عابدین نے اپنے حاشیے میں ذکر کی ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ دارالاسلام میں ذمی عموماً کم سطوت کے مالک ہوتے ہیں اور ایک طاقتور کا اپنے سے کمزور پر ظلم زیادہ قبیح ہوتا ہے۔ ردالمحتار علی الدر المختار المعروف بحاشیة ابن عابدین (بیروت: دار إحیاء التراث العربی، ۱۹۹۸ء)، ج ۶ ،ص ۲۱۰۔

۱۱۔ بروایت عبداللہ بن عمرو: محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح ، کتاب الجزیہ ، باب اثم من قتل معاهداً ؛ أحمد ،المسند ، (بیروت: عالم الکتب، ۱۹۹۸) حدیث نمبر ۶۷۰۷؛ احمد بن شعیب النسائی ،

السنن، کتاب القسامة والقود والديات، باب القود بين الاحرار ؛ محمد بن یزید ابنِ ماجہ ،کتاب الديات، باب" من قتل معاهداً" ۔ اورمبارک بن محمد ابنِ اثیر الجزری کے بقول" معاہَد" کا زیادہ تر اطلاق اہلِ ذمہ پر ہی کیا جاتا ہے اگر چہ دوسرے کفار کو بھی یہ نام اس صورت میں دیا جاسکتا ہے جب وہ جنگ نہ کرنے کی شرط پر صلح کرلیں۔النهاية في غريب الحديث (بیروت: دار إحياء التراث العربي، ۲۰۰۱ء)، ج ۳،ص ۹۷۴۔

۱۲۔ بروایتِ علیؓ: مسنداحمد، حدیث نمبر ۶۷۹۷؛ صحیح بخاری ، کتاب الديات ، باب " لا يقتل مسلم بكافر" ؛ سنن نسائی ، کتاب القسامة، باب " سقوط القود من المسلم للكافر "؛ سلیمان بن الأشعث ابو داؤد، السنن، کتاب الديات، باب " أ يقاد مسلم بكافر" ؛ محمد بن عیسیٰ الترمذی، السنن، کتاب الديات، باب " ما جاء في القصاص "

۱۳۔ اسے بھی حضرت علیؓ ہی کی روایت سے احمد ، نسائی، اور محمد بن عبداللہ حاکم نے ذکر کیا ہے (المستدرك على الصحيحين، کتاب قسم الفيء) اور المنتقیٰ اور اسکی شرح میں اسے صحیح قرار دیا گیا ہے۔حوالہء سابق۔

۱۴۔ محمد بن علی الشوکانی، نیل الاوطار، بیروت: دار الجیل، ۱۹۷۳ء)، ج ۷، ص ۱۵۴۔

۱۵۔ دیکھئے الجوهر النقي مع السنن الكبرىٰ ، (حیدرآباد، مجلس دائرة المعارف النظامية ، ۱۳۴۴ھ)، ج ۸، ص ۳۴۔

۱۶۔ اس روایت کو بیہقی نے ضعیف قرار دیا ہے، السنن، کتاب النفقات ، باب "بيان ضعف الخبر الذي روى في قتل المومن بالكافر" اس پر علی بن عثمان ابن الترکمانی کی تنقید کے لیے ملاحظہ کیجئے الجوهر النقي ۔نیز دیکھئے عبد الرزاق الصنعانی، المصنف، کتاب العقول، باب" قود المسلم بالذمي" ۔

۱۷۔ السنن الكبرى، کتاب النفقات ، باب"بيان ضعف الخبر الذي روى في قتل المومن

بالکافر"۔

۱۸۔ عبد الرزاق بن ہمام الصنعانی، المصنف، کتاب العقول، باب "قود المسلم بالذمی"۔

۱۹۔ اس بارے میں امام احمد بن علی الجصاص الرازی کی تحریر کا جائزہ لیا جا سکتا ہے دیکھئے احکام القرآن، ج ۱، باب "کافر کے بدلے میں مسلمان کا قتل"، (بیروت: دار إحیاء التراث العربی، ۱۹۸۵) ج ۱، ص ۱۷۳ سے ۱۷۸۔

۲۰۔ ابو یوسف، کتاب الخراج، (قاھرۃ: المطبعۃ السلفیۃ: ۱۳۸۲ ھ)، ص ۱۲۵، دیکھئے بیہقی، السنن الکبریٰ، باب "لا یأخذ المسلمون من ثمار أھل الذمۃ ۔۔۔ الخ۔ کتاب الخراج کے مطابق ان صحابی کا نام "حکیم بن ھشام" نہیں بلکہ "ھشام بن حکیم" ہے جبکہ حمص پر مامور شخصیت کا نام "عیاض بن غنم" تھا۔ حدیث "إن اللہ ۔۔۔ الخ" کے لیے دیکھئے صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ، باب "الوعید الشدید لمن عذب الناس بغیر حق۔"

۲۱۔ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۵ سے ۱۶، دیکھئے بیہقی، حوالہء سابق۔

۲۲۔ کتاب الخراج، ص ۷۲۔

۲۳۔ اس بارے میں فقہاء میں اختلاف پایا جاتا ہے، اوپر جس موقف کا ذکر کیا گیا ہے وہ احناف کا ہے۔

۲۴۔ الفروق، ج ۲، ص ۳۳۳۔

۲۵۔ دیکھئے حوالہ نمبر ۱۰۔

۲۶۔ حدیثِ ابن عمر (متفق علیہ)۔

۲۷۔ بروایتِ ابو یوسف: کتاب الخراج، ص ۱۴۴۔

۲۸۔ حوالہء سابق۔

۲۹۔ احمد بن یحییٰ البلاذری، فتوح البلدان (بیروت: دار الفکر ۱۹۹۲ء)، تحقیق سھیل زکار، ص ۱۵۵۔

۳۰۔ شمس الدین الرملی، نهاية المحتاج الیٰ شرح المنهاج (بیروت: دار إحیاء التراث العربی،۱۹۹۲ء)، ج ۸،ص ۴۹ سے ۵۰۔

۳۱۔ سورۃ البقرہ: ۲۵۶۔

۳۲۔ سورۃ یونس: ۹۹۔

۳۳۔ اسے ابنِ کثیر نے ابنِ جریر کی طرف منسوب کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ''اسے ابوداؤد، النسائی، ابنِ ابی حاتم اور صحیح میں ابنِ حبان نے روایت کیا ہے۔۔۔ اور اسی طرح مجاہد، سعید بن جبیر، شعبی، حسن البصری اور دوسروں کا کہنا ہے کہ یہ اسی بارے میں نازل ہوئی۔۔۔'' ابو الفداء اسماعیل ابنِ کثیر، تفسیر القرآن العظیم، (مدینہ: دار طیبة، ۱۹۹۹ء) ج۱، ص ۶۸۲۔

۳۴۔ سورۃ الحج: ۳۹ سے ۴۰۔

۳۵۔ طبری، تاریخ، ج ۲، ص ۴۴۹۔

۳۶۔ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۴۶۔

۳۷۔ دیکھئے أحکام الذمیین والمستأمنین، ص ۹۶ سے ۹۹۔

۳۸۔ دیکھئے ڈاکٹر علی حسنی الخربوطلی، الإسلام و اهل الذمة، (قاہرہ: المجلس الأعلي للشئون الإسلامية، ۱۹۶۹ء) ص ۱۳۹، اور تھامس آرنلڈ، الدعوۃ الی الاسلام (قاہرہ: مکتبة النهضة المصرية، ۱۹۷۰، طبع سوم، ترجمہ حسن ابراہیم) ، ص ۸۳ سے ۸۶۔

۳۹۔ گستاف لوبون، حضارة العرب، (قاہرہ: دار إحیاء الکتب العربیة، ۱۹۵۶) ترجمة عادل زعیتر ص ۱۲۸ حاشیہ۔

۴۰۔ ایڈم متز (استاد السنہ شرقیہ، جامعہ باسل، سوئٹزر لینڈ)، الحضارة الإسلاميه فی القرن الرابع الهجری ترجمہ، دکتور عبد الهادی ابو ریدة
(قاہرہ: مطبعة لجنة التأليف و الترجمة، ۱۹۴۷، طبعِ دوم)، فصل، ''یہود و نصاریٰ''، ج ۱،

ص ۵۲۔

۴۱۔ سورۃ آل عمران:۱۱۸۔

۴۲۔ حصہ اوّل، ص ۱۰۵۔

۴۳۔ ان صاحب کا نام حسن بن خاقان تھا۔ نیز دیکھئے، جلال الدین سیوطی، حسن المحاضرة في تاريخ مصر والقاهرة (قاہرہ: دار إحياء الكتب العربية، ۱۹٦۷ء) ج ۲، ص ۲۰۱۔ اس کے علاوہ ملاحظہ ہو ایڈم متز، الحضارة الإسلامية، ج ۱ ص ۷٦۔

۴۴۔ حاشیہء ابنِ عابدین، ج ٦، ص ۲۵۴۔

۴۵۔ نور الدین علی ہیثمی نے اسے مجمع الزوائد میں ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں، ''اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اسکے رجال صحیح کے ہیں''۔ (قاہرہ: مكتبة القدسي، ۱۳۵۳ھ) ج ۱۰ ص ٦۲۔

۴٦۔ اسے محمد ابنِ حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ دیکھئے كتاب التاريخ، باب إخباره عما يكون في أمته من الفتن۔ ہیثمی کے مطابق ''اسے ابویعلی نے روایت کیا ہے اور اسکے رجال صحیح کے ہیں۔ دیکھئے مجمع، ج ۱۰، ص ٦۴۔

۴۷۔ قیراط: درہم ودینار وغیرہ کا ایک حصہ، اہلِ مصر کے ہاں اس کا بکثرت استعمال اور ذکر کیا جاتا تھا بلکہ اب بھی ناپ تول وغیرہ میں مستعمل ہے۔ لہذا کسی بھی شے کو مثلاً ۲۴ قیراط میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۴۸۔ اس حدیث کی دونوں روایتیں صحیح مسلم میں موجود ہیں دیکھئے کتاب فضائل الصحابة باب وصية النبي بأهل مصر۔

۴۹۔ اس کا ذکر امام شرف بن یحیٰی النووی نے رياض الصالحين من كلام سيد المرسلين میں کیا ہے باب بر الوالدين۔

۵۰۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ج ۱، ص ٦۲: ''اسے طبرانی نے دو اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے اور ایک کے

رجال صحیح کے ہیں، اسی طرح دوسری روایت کے ساتھ حاکم نے بیان کیا ہے اور اسے شیخین کی شرائط پر صحیح قراردیا ہے جس سے ذہبی نے بھی اتفاق کیا ہے۔ ج ۲، ص۷۵۳، الزہری کے نزدیک ''رحم'' اس لیے کہا گیا کہ اسماعیل کی والدہ ان لوگوں میں سے تھیں۔

۵۱۔ سورۃ الاحزاب:۳۶۔

۵۲۔ سورۃ النساء:۱۳۵۔

۵۳۔ سورۃ المائدہ:۸۔

۵۴۔ سورۃ النجم:۳۸۔

۵۵۔ ملاحظہ ہو بلاذری، فتوح البلدان، ص۱۹۰، اور ابو عبید قاسم بن سلام، کتاب الأموال (لاہور: المکتبۃ الأثریۃ، د۔ت) ص۱۷۰ سے ۱۷۱۔

۵۶۔ فتوح البلدان، ص ۱۴۶۔ بلاذری کے مطابق اس کلیسا کا قصہ یہ ہے کہ معاویہ اور عبدالملک کے زمانے سے اموی خلفاء نصرانیوں کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ اسے مسجدِ اموی کی توسیع میں شامل کر لیا جائے، لیکن وہ لوگ راضی نہ ہوئے۔ اور ولید نے اپنے دور میں انہیں جمع کر کے بھاری قیمت پیش کی لیکن انھوں نے انکار کردیا۔ اس پر ولید نے کہا: اگر تم میری پیشکش قبول نہ کروگے تو میں اسے منہدم کر دوں گا! انھوں نے کہا: اے امیر المومنین! جو شخص اسے منہدم کرنے کی کوشش کرے وہ یا تو پاگل ہوجائے گا یا اسے کوئی اور بیماری لاحق ہوجائے گی''۔ اس بات پر ناراض ہوکر ولید نے پھاوڑا منگوا کر خود اس کی دیوار گرانا شروع کی اسکے بعد مزدوروں کو بلوا کر سارا کلیسا منہدم کروادیا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے۔ تو نصاریٰ نے اپنے کلیسا کے ساتھ ولید کے سلوک کی ان سے شکایت کی۔ انھوں نے حاکمِ دمشق کو حکم دیا کہ مسجد کا توسیع شدہ حصہ منہدم کر کے کلیسا بنا دیا جائے لیکن اہلِ دمشق کو یہ بات پسند نہ آئی اور وہ کہنے لگے: کیا ہم اپنی مسجد میں اذانیں دینے اور نمازیں ادا کرتے رہنے کے بعد اسے

گرادیں؟ سلیمان بن حبیب المحاربی اور اس وقت کے دوسرے فقہاء نصاریٰ کو راضی کرنے ان کے پاس پہنچے۔ عیسائیوں نے مطالبہ کیا کہ کلیسائے یوحنا سے وہ صرف اس صورت دستبردار ہوں گے اگر انہیں فتح کے موقع پر قبضے میں لئے گئے تمام گرجے لوٹا دیے جائیں۔ مسلمان اس پر بخوشی رضامند ہو گئے اور عمر بن عبدالعزیز کو اس کی اطلاع بھجوا دی گئی۔ انھوں نے بھی بخوشی اس معاملے کی اجازت دے دی۔

۵۷۔ حوالہ سابق ص ۲۱۴۔

۵۸۔ ابن کثیر، البداية و النهاية (بيروت: دار إحياء التراث العربي، ۱۹۸۸ء) ج ۸، ص ۵۔

بابِ دوم

ذمیوں کے فرائض

ہم یہ دیکھ چکے کہ اسلامی معاشرہ غیر مسلم شہریوں کو کیا حقوق عطا کرتا اور ان کے تحفظ کو کیسے یقینی بناتا ہے۔ اب یہ جان لینا بھی مفید ہوگا کہ ان حقوق کے مقابل اسلام ان لوگوں پر کون سے فرائض عائد کرتا ہے کہ ہر حق کے مقابل بلاشبہ ایک فرض بھی ہوا کرتا ہے۔

ذمیوں پر عائد ہونے والے فرائض درج ذیل ہیں:

۱۔ مالی فرائض : جزیہ، خراج اور تجارتی ٹیکس کی ادائیگی۔

۲۔ دیوانی معاملات وغیرہ میں قانونِ اسلامی کے احکام کی پابندی۔

۳۔ مسلمانوں کے دینی شعائر اور احساسات و جذبات کا خیال رکھنا۔

جزیہ وخراج

جزیہ ایک ایسا سالانہ فی کس ٹیکس ہے جو بالغ اور استطاعت رکھنے والے مردوں پر ان کی وسعت کے مطابق لگایا جاتا ہے جبکہ مفلس اور نادار لوگ اس سے کلیۃً مستثنیٰ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔﴿اللہ نے جس کو جتنا کچھ دیا ہے اس سے زیادہ کا وہ اُسے مکلّف نہیں کرتا﴾(۱) جزیہ کی مقدار کی کوئی حد مقرر نہیں بلکہ اس کا دارومدار حاکم کی صوابدید پر ہے اور وہ ادا کرنے والوں کی استطاعت کا خیال رکھنے اور ان پر بار نہ ڈالنے کا بالکل اسی طرح پابند ہے جس طرح امت کی عام مصلحت کا خیال رکھنے کا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے مالدار لوگوں پر ۴۸ درہم، متوسط طبقے کے افراد پر ۲۴ اور نچلے درجے کے امیر لوگوں پر ۱۲ درہم مقرر کئے۔ اور اس طرح ٹیکس دہندگان کی حیثیت کے مطابق شرح محاصل میں تفاوت

کا اصول جدید نظامِ محاصل سے بہت پہلے وضع کیا۔

تاہم حضرت عمرؓ کے فعل اور آنحضرتؐ کے اس ارشاد میں کوئی تعارض نہیں جو انہوں نے معاذؓ کو یمن بھیجتے وقت فرمایا تھا کہ ہر بالغ سے ایک دینار وصول کرنا(۲) کیونکہ اہلِ یمن کے ہاں فقر غالب تھا لہذا نبیؐ نے ان کی حالت کو مدنظر رکھا۔

جزیہ کے وجوب کی قرآنی بنیاد سورۂ توبہ میں یہ ارشاد باری ہے۔﴿جنگ کرو اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اسکے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔(ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کررہیں﴾(۳) یہاں'' چھوٹے بن کر رہنے'' سے مراد اطاعت قبول کرنا، ہتھیار ڈال دینا اور اسلامی ریاست کے سربراہ کی سیادت تسلیم کرلینا ہے۔حدیث میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے اہل بحرین سے جزیہ وصول کیا تھا۔اسی طرح خلفائے راشدین نے اہل کتاب اور تمام مفتوحہ علاقوں سے جزیہ وصول کیا اور اس پر مسلسل عمل ہونے کی وجہ سے اسکی حیثیت اجماع کی ہوگئی۔

خراج دراصل ذمیوں کی ملکیت میں باقی رہنے والے رقبہٴ زمین پر عائد کیے جانے والے ایک ٹیکس کا نام ہے چونکہ شرحِ خراج کے تعین کا اختیار حاکم کو حاصل ہے لہذا وہ چاہے تو ان لوگوں کی زرعی پیداوار میں کسی مخصوص شرح (مثلاً ایک تہائی یا چوتھائی) پر شراکت طے کرلے یا زمین کی نوعیت کے لحاظ سے کوئی مقدار مقرر کردے۔

جزیہ اور خراج میں فرق یہ ہے کہ ذمی کے قبول اسلام پر اول الذکر تو ساقط ہو جاتا ہے لیکن خراج ساقط نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کا بدستور پابند رہتا ہے۔ اپنے اصل دین پر قائم

رہنے والے ذمی کو زمین کا خراج دینے کے علاوہ پیداوار کا عشر یا نصف عشر بھی دینا ہوگا۔ جیسا کہ ائمہ اربعہ کے مسلک کے برعکس فقہاء کا موقف ہے۔ خراج کو اس ٹیکس کی مثل قرار دیا جاسکتا ہے جسے آج کل غیر منقولہ املاک پر عائد کیا جاتا ہے اور اسی طرح عشر زرعی فوائد پر ایک طرح کا ٹیکس سمجھا جاسکتا ہے۔

ذمیوں سے جزیہ کیوں وصول کیا جاتا تھا؟

چیزوں پر سطحی نظر ڈالنے کے عادی کچھ لوگ جزیہ اسلام کے ظلم کی دلیل سمجھتے ہیں حالانکہ اگر وہ انصاف سے کام لیں اور بات کی حقیقت پر غور کریں تو جان سکتے ہیں کہ ایک معمولی شرح پر مشتمل جزیہ لگانے میں اسلام بالکل حق بجانب تھا۔

اسلام نے اپنے پیروؤں پر فوجی خدمت کو فرض کفایہ یا فرض عین کے طور پر لاگو کیا ہے اور ریاست کے دفاع کی ذمہ داری بھی ان ہی کے سپرد کی ہے جبکہ غیر مسلموں کو، انکے اسلامی ریاست میں رہنے کے باوجود، اس سے معاف رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست ایک عقیدہ، یا معاصر اصطلاح میں، ''آئیڈیالوجی'' پر قائم ریاست ہے۔ اور ایسی ریاست کے دفاع میں وہ لوگ نہیں لڑا کرتے جو اس آئیڈیالوجی کے قائل نہ ہوں۔ ایک شخص کو ایسے نظریے کی خاطر سر ہتھیلی پر رکھنے لئے کہنا جسے وہ باطل سمجھتا ہو کوئی معقول بات نہیں۔ بلکہ اکثر دوسروں کا دین خود انہیں کسی اور مذہب کی حفاظت کرنے اور اس کی خاطر جنگ لڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔ جہاد ایک مقدس دینی فریضہ اور ایسی عبادت ہے جس کے ذریعے ایک مسلمان اپنے خدا کا قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ ایک مجاہد کا ثواب دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر قیام کرنے والے عبادت گزار سے بھی زیادہ ہے ۔ اسی لئے فقہاء کا کہنا ہے کہ ایک مسلمان کو سب سے زیادہ تقرب دلانے والی عبادت جہاد ہی ہے۔ چنانچہ اسلام نے جہاد فقط مسلمانوں پر فرض کیا ہے ۔البتہ اسلام اپنے غیر

مسلم شہریوں پر دفاع و حفاظتِ وطن کے اخراجات میں جزیہ کے ذریعے شریک ہونے کی پابندی ضرور لگاتا ہے۔لہذا جزیہ کی ادائیگی ذمیوں کی جانب سے اسلامی حکومت تسلیم کرنے کی علامت ہے۔ درحقیقت یہ ان عسکری خدمات کا مالی عوض ہے جو فقط مسلمانوں پر واجب کی گئی ہیں۔ جزیہ کی ادائیگی کا پابند فقط وہ مرد ہے جو ہتھیار اٹھانے کے قابل ہو۔ یہ نہ تو عورتوں اور نہ ہی بچوں پر لاگو کیا جاتا ہے کیونکہ وہ جنگ لڑنے والوں میں سے نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے'' اسے عورتوں اور لڑکوں پر مت لگاؤ''۔ چنانچہ فقہاء کا کہنا ہے کہ اگر کوئی عورت دارالاسلام میں داخلے کی اجازت کی غرض سے جزیہ ادا کرنا چاہے تو اس سے جزیہ لینا ناحق ہوگا۔اوراگر وہ خاتون (یہ جانتے ہوئے کہ اس پر جزیہ نہیں) اپنی خوشی سے دے تو اس سے ہدیتاً قبول کیا جائے گا۔بوڑھے، نابینا، ذہنی و جسمانی معذور اور وہ افراد جو ہتھیار نہیں اٹھا سکتے عورتوں اور بچوں کی ہی مانند جزیہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہیں۔ مسلمانوں کی رواداری کا ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے عبادت کی نیت سے اپنی خانقاہوں میں الگ تھلگ ہو جانے والے راہبوں کو بھی جزیہ سے مستثنیٰ قرار دیا کیونکہ یہ لوگ جنگ میں حصہ نہیں لیا کرتے۔(۴)

مورخ ایڈم متز کا کہنا ہے کہ اہلِ ذمہ کو مسلمانوں کی رواداری اورحمایت اس درجہ حاصل تھی کہ ہر ایک اپنی استطاعت کے مطابق جزیہ ادا کیا کرتا۔ یہ جزیہ دفاع وطن ٹیکس سے زیادہ مشابہ تھا۔ لہذا یہ صرف ہتھیار اٹھانے پر قادر شخص ہی کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ جبکہ معذور، راہب اور اہل خانقاہ اسکی ادائیگی کے پابند نہیں تھے الّا یہ کہ وہ آسانی سے دے سکیں۔(۵)

مزید برآں ذمیوں پر جزیہ لگائے جانے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ یہ وہی وجہ ہے جس کے باعث کوئی بھی حکومت عوام پر ٹیکس عائد کیا کرتی ہے۔ ٹیکس کا مقصد لوگوں کو رفاہِ عام

کے کاموں اور حکومت کی دیگر سرگرمیوں جیسے عدلیہ، پولیس، سڑکیں بنوانے، پل تعمیر کرانے اور اپنی مسلم، غیر مسلم رعایا کو مناسب زندگی کی کفالت جیسے فرائض پر اٹھنے والے اخراجات کی ادائیگی میں شریک کرنا ہے۔ان سب میں مسلمان تو صدقۂ فطرہ وغیرہ کے علاوہ اپنے اموال، کاروبار، مویشیوں، کھیتیوں اور پھلوں وغیرہ کی زکوٰۃ ادا کر کے شریک ہوتے ہی ہیں۔ اگر غیر مسلموں سے ایک معمولی رقم کی صورت میں حصہ لینے کو کہا جائے تو کوئی تعجب نہیں۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ مالکی کی کتابوں میں جزیہ کے احکام زکوٰۃ کے احکام کے ذیل میں زیر بحث لائے جاتے ہیں۔(۶)

جزیہ کب ساقط ہوتا ہے؟

جزیہ، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، سب سے پہلے تو اس دفاع کا عوض ہے جو اسلامی ریاست ذمیوں کو فراہم کرتی ہے لہذا جب ریاست یہ دفاع نہ کر سکے تو اسے یہ جزیہ لینے کا کوئی حق نہیں۔ابو عبیدہ کو جب انکے نائبین نے شام کے علاقوں سے رومی لشکر اکٹھے ہونے کی اطلاع دی تو انہوں نے جواب میں لکھا کہ جس سے جزیہ لے چکے اسے لوٹا دو اور یہ اعلان کردو" چونکہ ہمیں اپنے خلاف لشکر کشی کی اطلاع ملی ہے اس لیے ہم آپ کو آپ سے لی گئی رقوم لوٹا رہے ہیں۔ آپ نے ہم پر شرط عائد کی تھی کہ ہم آپ کی حفاظت کریں جو کہ ہمارے لئے ممکن نہیں۔ ہم نے آپ سے جو کچھ وصول کیا تھا وہ لوٹا دیا ہے البتہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں نصرت سے سرفراز کیا تو ہم ان شرائط پر کاربند رہیں گے اور جو کچھ ہمارے اور آپ کے درمیان طے پایا تھا اس کے پابند رہیں گے۔" (بروایتِ امام ابو یوسف، کتاب الخراج)۔ خالد بن ولیدؓ اور دیگر مسلم سپہ سالاروں کی طرف سے ذمیوں کے ساتھ کئے گئے کئی معاہدوں میں یہ شق بھی شامل تھی " اگر ہم تمہارا

دفاع کریں تو ہم جزیہ وصول کرنے کے حقدار ہوں گے وگرنہ نہیں، ہاں مگر جب ہم (پھر سے) تمھاری حفاظت کریں۔'' (بروایتِ طبری، تاریخ)۔اسی طرح اگر ذمی مسلمانوں کے ساتھ دارالاسلام کے دفاع میں شریک ہوجائیں تب بھی ان پر سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے دور میں مسلمانوں اور اہل ذمہ کے درمیان طے پانے والے معاہدوں میں اس کی تصریح کی گئی۔

جزیہ جمع کرنے کے طریق کار اور اوقات کے متعلق الاسلام و اهل الذمة (۷) کے مصنف نہایت قابلِ اعتماد مصادر سے اخذ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔''جزیہ سال میں ایک مرتبہ قمری مہینوں کے حساب سے جمع کیا جاتا تھا (۸) اور رقم یا اجناس کی صورت میں ادا کرنے کی اجازت تھی۔ مگر جزیہ کے بدلے مردار، خنزیر یا شراب پیش کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کے علاوہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے اہل ذمہ کے ساتھ تخفیف سے کام لینے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ''جو شخص جزیہ ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اس سے درگزر کرو اور جو عاجز ہو اس کی مدد کرو کیونکہ ہمیں وہ صرف ایک یا دو سال کے لئے ہی درکار نہیں (بلکہ ہمارے مستقل ساتھی ہیں)''۔(۹)

کئی مرتبہ مسلم حکومت فصلیں تیار ہونے تک جزیہ کی ادائیگی مؤخر کر دیا کرتی تھی تاکہ ذمی تکلیف میں مبتلا ہوئے بغیر (جزیہ) دے سکیں۔ ابوعبید (۱۰) نے لکھا ہے کہ غلہ تیار ہونے تک تاخیر کی وجہ ان کے ساتھ نرمی ہے۔ اسی طرح جزیہ اکٹھا کرنے میں بھی نرمی اور رحمت کا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے ایک عامل جزیہ کی رقوم لے کر حاضر ہوئے تو انہیں وہ بہت زیادہ معلوم ہوئی جس پر انہوں نے اپنے عامل سے کہا:'' میرا خیال ہے تم نے لوگوں کو کنگال کر دیا ہے۔'' انہوں نے جواب دیا:'' نہیں، خدا کی قسم! ہم نے درگزر سے کام لیتے ہوئے اور بالکل شفاف طریقے سے جزیہ وصول کیا

ہے‘‘۔ حضرت عمرؓ نے پھر پوچھا: ’’کوڑے (کے استعمال) اور گرانبار کیے بغیر؟‘‘ عامل نے اثبات میں جوابدیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے خوش ہو کر فرمایا: ’’اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ایسا میرے دورِ حکومت میں نہیں ہونے دیا۔‘‘(۱۱)

محصولِ تجارت

حضرت عمرؓ نے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل ہونے کی صورت میں ذمیوں پر سال میں ایک مرتبہ مال تجارت کا نصف عشر عائد کیا تھا جو کہ آجکل لی جانیوالی کسٹم ڈیوٹی سے مشابہ تھا۔ حضرت انس بن مالکؓ اور زیاد بن حدیر نے ان سے روایت کیا ہے کہ وہ مسلمان تاجروں سے عشر کا چوتھا حصہ اور ذمی تاجروں سے مسلم تاجروں سے دگنا یعنی نصف عشر جبکہ حربی تاجروں سے عشر وصول کیا کرتے تھے۔(۱۲) یہ بالکل واضح ہے کہ مسلمانوں پر لگایا جانے والا ٹیکس اموالِ تجارت پر لاگو ہونے والی زکوٰۃ ہی تھی خواہ وہ لوگ نقل مکانی کریں یا نہ کریں۔

حربیوں پر لگایا جانے والا ٹیکس معاملہ بالمثل کے باب سے تھا۔ چنانچہ جب زیاد بن حدیر سے پوچھا گیا کہ وہ کن لوگوں سے عشر وصول کیا کرتے تھے تو انہوں نے جواب دیا ’’ہم کسی مسلمان یا ذمی سے عشر وصول نہیں کرتے تھے بلکہ اہل حرب کے تاجروں سے بالکل اسی طرح عشر وصول کرتے جس طرح کہ ان کے ہاں جانے پر وہ ہم سے وصول کیا کرتے تھے‘‘۔(۱۳) ان دو اصناف کے بارے میں ان کا طریق کار واضح اور متعین تھا جیسا کہ ابوعبید نے ذکر کیا ہے۔(۱۴)

البتہ ذمی تاجروں پر نصف عشر لگانے کی توجیہ کے متعلق فقہا میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ابوعبید نے اسے ان شرائطِ صلح میں سے قرار دیا ہے جن پر یعنی ذمیوں نے حضرت عمرؓ

کے ساتھ اتفاق کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں : ''جس امر کی توجیہ دریافت کرنے میں مجھے اشکال پیدا ہو گیا تھا وہ ذمیوں سے اس نصف عشر کی وصولی تھی۔اب اس سلسلے میں میرا موقف ہے کہ مسلمان نہ ہونے کی وجہ سے ان لوگوں سے صدقہ (یعنی ربع عشر) تو وصول نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی یہ حربی ہیں کہ ان سے وہی کچھ وصول کیا جائے جو وہ ہم سے لیتے ہیں (یعنی عشر)۔ جب تک میں نے حضرت عمرؓ کی حدیث پر تدبر نہ کیا اس کی حقیقی نوعیت جاننے میں مجھے کامیابی نہ ہوئی ۔ میں نے جان لیا ہے کہ اس پر انہوں نے ذمیوں کے ساتھ صلح کر رکھی تھی''۔اس حدیث یا اثر کے ذکر کے بعد ابو عبید کہتے ہیں میری رائے میں ان کے تاجروں سے (نصف عشر) وصول کرنا شرائط صلح کا حصہ ہونے کے باعث اب ان پر مسلمانوں کے حقوق میں سے ہے۔(۱۵)

مشہور تابعی فقیہ امام ابن شہاب زہری کے ہاں ملنے والی ایک توجیہ جس پر ابو عبید دوسری توجیہات کو ترجیح دیتے ہیں یہ ہے کہ:''اسحاق بن عیسیٰ بتاتے ہیں کہ مالک بن انسؒ نے فرمایا: میں نے ابن شہاب زھری سے دریافت کیا'' عمرؓ اہل ذمہ سے عشر کیوں لیا کرتے تھے؟'' انہوں نے جواب دیا کہ جاہلیت کے دور میں ان لوگوں سے لیا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ نے اسی کو جاری رکھا۔''

ابو عبید کا کہنا ہے کہ شرائط صلح کے حوالے سے ہماری بیان کردہ پہلی توجیہ حضرت عمرؓ کی حکمتِ عملی سے زیادہ موافقت رکھتی ہے اور قابل ترجیح ہے۔ خود امام مالک اسی کے قائل تھے۔(۱۶)

بعض علمائے احناف نے ذمی سے وصول کی جانے والی رقم کے دگنا ہونے کی توجیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ لگان دفاع فراہم کرنے کی وجہ سے عائد کی جاتی ہے اور تاجر کو ایک مسلم سے زیادہ حفاظت کی ضرورت ہوا کرتی ہے کیونکہ چوروں کو ذمیوں کے مال میں

زیادہ طمع ہوتی ہے۔(۱۷)

اس باب میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک اور رائے اختیار کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس زمانے میں زیادہ تر مسلمان مملکت اسلامی کے دفاع سے وابستہ تھے لہذا تجارت ساری کی ساری ذمیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ۔فقہا نے سوچا کہ مسلمانوں کو تجارت کی طرف مائل کرنے کے لئے اور تجارتی مفادات کی حفاظت کیلیے ان پر عائد محصول میں کمی کر دی جائے''۔(۱۸)

سب جانتے ہیں کہ فقہا نے (دوگنا لگان کا) یہ حکم حضرت عمرؓ کے فعل کو بنیاد بنا کر لگایا تھا لہذا قابل ترجیح یہ ہے کہ اسے حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کیا جائے نہ کہ فقہا کی جانب۔ اور اگر ہم یہ مان بھی لیں (کہ ایسا کرنے والے فقہا تھے) تو بھی ترجیحاً یوں کہا جائیگا کہ فقہا نے غیر مسلم تاجروں پر ٹیکس بڑھانے کا فیصلہ مسلمانوں کو تجارت کی طرف مائل کرنے اور ان کے تجارتی مفادات کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا۔ کیونکہ ان کی جانب سے اٹھایا گیا نیا اقدام مسلمانوں کے ذمہ محصول میں کمی نہیں بلکہ دوسروں پر واجب الادا شرح لگان میں اضافہ تھا۔

ان توجیہات کے مختلف ہونے کا سبب اس بارے میں امکانِ خطا سے پاک کسی نص کا فقدان ہے اور یہ اقدام حضرت عمرؓ نے مصلحتاً اجتہاد کرتے ہوئے کیا جس کی متقاضی سیاست شرعی تھی۔ اگر ہم ابوعبید کی اختیار کردہ رائے بھی مانیں کہ حضرت عمرؓ نے ایسا صرف ان لوگوں کے ساتھ کی گئی صلح کی بنا پر کیا تھا تو اس صورت میں بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاہدۂ صلح کی شقیں عموماً مصالح پر مبنی ہوا کرتی ہیں۔مزید برآں زمانے اور ماحول کے اعتبارات بدل بھی جایا کرتے ہیں۔

میرے نزدیک عقلی طور پر راجح ترین توجیہ ڈاکٹر عبدالکریم زیدان کی بیان کردہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ محصول تجارت کی شرح اس لیے دگنا کی گئی کہ ذمی کے صرف ایسے تجارتی اموال میں سے محصول لیا جاتا تھا جنہیں وہ ایک سے دوسرے علاقے میں لے جاتا جبکہ مسلمانوں کے اموال کے برعکس اسکے اموال تجارت اورذاتی مال و دولت مثلاً سونا چاندی وغیرہ ، کھیتی اور مویشیوں میں سے کچھ نہیں لیا جاتا جبکہ مسلمان سے ان تمام اموال کی زکوۃ وصول کی جاتی اور یوں ایک مسلمان پر عائد شدہ مالی واجبات ذمی کے واجبات سے بڑھ جاتے ہیں۔اور ان دونوں کے واجبات کو یکساں نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمان سے وصول کی جانے والے مال کی حیثیت درحقیقت زکوٰۃ کی ہے اور اس کی مقدار بھی اسی کی سی ہے لہذ عبادات میں شامل ہونے کے باعث اس کی شرح کو بڑھانا ممکن نہیں۔

یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ ذمی سے جزیہ کے علاوہ خراج زمین بھی لیا جاتا ہے اس لیے اس کے واجبات مسلمان کے واجبات کے مساوی ہو جاتے ہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں ہم کہیں گے کہ خراج ذمی پر (غیر مسلم ہوتے ہوئے) ہی نہیں بلکہ قبولِ اسلام کی صورت میں بھی بدستور لاگورہتا ہے اور اگر ایک مسلمان کے پاس خراجی زمین ہوتو اس پر بھی خراج واجب ہو جاتا ہے۔ جزیہ اگرچہ ذمی کے ساتھ خاص ہے، مگر اس کی مقدار نہایت معمولی ہے اور یہ ہر ذمی پرلاگو بھی نہیں بلکہ صرف ہتھیار اٹھانے کے قابل افراد پر ہے اور ان سے بھی اس وقت ساقط ہو جاتا ہے جب انہیں فوجی خدمات کے لئے طلب کرلیا جائے۔(۱۹)

ان باتوں کے پیشِ نظر اگر ذمی کے حوالے سے صورتحال بدل جائے اور اس سے اس کے ظاہراور پوشیدہ اموال (یعنی مویشیوں، کھیتوں، پھلوں، رقوم، اشیاء اور کاروبار) پر مسلمانوں سے لی جانے والی زکوٰۃ کے مساوی محاصل لئے جانے لگیں تو ایسی صورت میں

ذمی تاجر پر بھی مسلمانوں ہی کے مساوی محصول میں کوئی حرج نہیں جو ایک مسلمان سے لیا جاتا ہے۔

اسلامی قانون کی پابندی

اہل ذمہ کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ مسلمانوں پر نافذ شدہ اسلامی احکام کی پابندی کریں کیونکہ وہ معاہدۂ ذمہ کی رو سے اسلامی ریاست کے شہری ہیں لہذا ان کے لیے ضروری ہے کہ ایسے تمام ریاستی قوانین کی پابندی کریں جو ان کے عقائد اور مذہبی آزادی سے مس نہیں رکھتے۔

احکامِ شریعت میں سے مسلمانوں کے احکامِ عبادات یا ایسے احکام جو عبادت کا یا دینی رنگ لیے ہوئے ہوں لاگو نہیں ہوتے۔ مثلاً زکوٰۃ جو کہ بیک وقت ایک محصول بھی ہے اور عبادت بھی۔ یا جہاد جو ایک اسلامی فریضہ ہے۔ اور فوجی خدمت بھی۔ اس لئے اسلام نے ان کے دینی احساسات کا خیال رکھا ہے کہ ان پر کوئی اسلامی عبادت واجب نہ کی جائے اور ان پر جہاد اور زکوٰۃ کی بجائے صرف جزیہ عائد کیا ہے۔

شخصی اور اجتماعی معاملات کے حوالے سے اپنے مذہب کی حلال کردہ اشیاء سے دستبردار ہو جانے کی ان پر کوئی پابندی نہیں اگرچہ وہ اشیاء اسلام میں حرام ہی کیوں نہ ہو مثلاً نکاح و طلاق کے امور، سور کا گوشت کھانا اور شراب پینا۔ لہذا اسلام انہیں ہر اس کام کی اجازت دیتا ہے جس کے حلال ہونے کے وہ قائل ہیں اور نہ تو ان کاموں کو باطل قرار دیتا ہے اور نہ ہی ان پر کوئی سزا مقرر کی گئی ہے۔

چنانچہ اپنی کسی محرم سے شادی کرنے والے مجوسی یا اپنی بھتیجی سے نکاح کرنے والے یہودی یا سور کا گوشت کھانے اور شراب پینے والے نصرانی سے اسلام کوئی تعرض نہیں کرتا

جب تک یہ لوگ ان امور کو حلال سمجھتے رہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان لوگوں کے اعتقادات سے کوئی تعرض نہ کریں۔ لیکن اگر یہ لوگ مسلمانوں کی شریعت سے ان امور کے بارے میں فیصلہ طلب کریں تو ہم ان کے درمیان اسلامی احکام کے مطابق فیصلہ کریں گے کیونکہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿پس اے نبی، تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔﴾ (۲۰)

بعض فقہا کی رائے میں جب یہ لوگ اپنا مقدمہ ہمارے سامنے لائیں تو ہمیں اپنی شریعت کی روشنی میں فیصلہ کرنے یا کسی فیصلے سے توقف کرنے کا اختیار ہے کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿اگر یہ تمھارے پاس (اپنے مقدمات لے کر) آئیں تو تمھیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو تو ان کا فیصلہ کردو ورنہ انکار کردو۔ اگر انکار کردو تو یہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ انصاف کو پسند کرتا ہے۔﴾(۲۱)

ان شخصی امور کے علاوہ جان، مال او رعزت کے، یعنی دیوانی اور فوجداری وغیرہ، معاملات میں وہ لوگ مسلمانوں ہی کی مانند شریعت اسلامی کے احکام کے پابند ہیں۔ اس بارے میں فقہا کا کہنا ہے کہ ان لوگوں کو اجمالاً وہی حقوق حاصل ہیں جو ہمیں اور ان پر وہی فرائض عائد ہوتے ہیں جو ہم پر ہیں لہذا اگر کوئی ذمی چوری کرے تو اس پر چوری کی حد اسی طرح جاری کی جائے گی جس طرح کہ مسلمان پر کی جاتی ہے اور جس نے قتل کیا یا راہزنی کی واردات کا ارتکاب کیا یا مال چھینا یا کسی عورت سے زنا کیا یا کسی پاکباز عورت پر تہمت لگائی یا اسی طرح کا کوئی اور جرم کیا تو اسے گرفتار کر کے وہی سزا دی جائے گی جو ایک مسلمان کے واسطے مقرر ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں ہمارے دین میں حرام ہیں اور وہ لوگ ان تمام باتوں میں اسلام کے حکم کے پابند ہیں جس میں ان کے دین کی مخالفت نہ ہوتی ہو۔

امام ابو حنیفہؒ کی رائے میں ذمی مرد یا عورت کے جرمِ زنا کی سزا ہمیشہ کوڑوں کی صورت میں دی جائے نہ کہ رجم سے ۔ کیونکہ پاکبازی کے ثابت ہونے میں، جس کی وجہ سے سزا میں شدت پیدا ہو جاتی ہے، مسلمان ہونا بھی شامل ہے۔

یہی مثال مالی اور دیوانی معاملات جیسا کہ خرید و فروخت ،اجارہ ،شراکت، رہن، شفعہ، مزارعت، بنجر زمین کی کاشت، حوالہ، کفالہ اور اسی طرح کے دوسرے معاہدات و تصرفات کی ہے جن کے ذریعے لوگ مال اور منافع کا تبادلہ کرتے ہیں اور جن کے ساتھ معاشی معاملات وابستہ ہوا کرتے ہیں۔چنانچہ وہ تمام معاہدات جو مسلمانوں کے لئے جائز ہیں اہل ذمہ کے لئے بھی جائز ہیں اور جو مسلمانوں کے ہاں فاسد ہیں وہ ان کے لیے بھی فاسد البتہ نصاری کے ہاں سور اور شراب کو بہت سے فقہا نے مستثنیٰ قرار دیا ہے کیونکہ نصرانیوں کے عقیدے کے مطابق یہ چیزیں حلال ہیں۔ البتہ ان پر پابندی یہ ہے کہ وہ ان کا کھلے عام اظہار نہ کریں۔سود البتہ ان کے ہاں بھی حرام ہے لہذا اس کی انہیں اجازت نہیں دی جا سکتی۔

مسلمانوں کے احساسات کا احترام

ذمیوں کی تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ جن مسلمانوں کے درمیان وہ بستے ہیں انکے احساسات کا احترام کریں اور جو اسلامی ریاست انہیں حفاظت اور رعایت فراہم کرتی ہے اس کے وقار کا خیال رکھیں۔

چنانچہ اسلام، پیامبرِ اسلام یا قرآنِ مجید کی اعلانیہ توہین اور ریاست کے عقیدہ و مذہب کے منافی تمام ایسے عقائد و افکار کو ترویج دینے کی اجازت نہیں جو ان کے بنیادی عقائد کا اسی طرح حصہ نہ ہوں جیسے تثلیث اور مسیح علیہ السلام کا سولی دیا جانا وغیرہ عیسائیوں کے عقیدے کا حصہ ہیں ۔ ان کے لئے کھلم کھلا شراب پینے ،سور کا گوشت کھانے اور اسی طرح دوسری اشیاء

جو اسلام میں حرام ہیں استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔اور انہیں یہ چیزیں مسلمانوں کو فروخت کرنے کی اجازت بھی نہیں کیونکہ اس سے اسلامی معاشرے میں خرابی پھیلنے کا اندیشہ ہے۔

ان پر لازم ہے کہ رمضان کے دنوں میں مسلمانوں کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے علانیہ طور پر کھانے پینے سے احتراز کریں۔ان پر لازم ہے کہ وہ ایسا کوئی کام علانیہ طور پر نہ کریں جو اسلام اپنے پیروکاروں کے لئے برا سمجھتا ہے اگرچہ وہ ذمیوں کے دین میں مباح ہی کیوں نہ ہو، اور یہ کہ وہ کسی ایسی صورت میں برآمد نہ ہوں جس سے مسلم اکثریت کو للکارے جانے کا تاثر ملتا ہوتا کہ معاشرے کے تمام عناصر سلامتی اور موافقت کے ساتھ رہ سکیں۔

مرتدین کے خلاف یمن میں عکرمہ بن ابوجہل کے ساتھ لڑائی میں شریک ہونے والے اور نبی ﷺ کے صحابی عرفہ بن حارثؓ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک نصرانی کو اسلام کی دعوت دی تو اس نے نبی ﷺ کو برے الفاظ سے یاد کیا۔ یہ بات انہوں نے عمرو بن العاص تک پہنچائی تو انہوں نے کہا کہ ہم ان کے ساتھ عہد کر چکے ہیں ۔حضرت معاذؓ نے کہا '' میں اس بات سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ ہم ان سے خدا اور رسول ﷺ کے معاملے میں خود کو ایذا پہنچانے کا معاہدہ کریں ۔ہمارا معاہدہ تو فقط یہ تھا کہ انہیں اپنے کلیساؤں کے اندر جو انکے جی میں آئے کہنے کی اجازت دے دیں اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالیں اورانہیں انکے دینی احکام پر عمل پیرا ہونے دیں اور یہ کہ جب وہ ہمارے پاس آئیں تو ہم ان کے درمیان اللہ کی نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلہ کریں'' ۔عمرو نے کہا '' آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں'' ۔(۲۲)

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ سورۃ الطلاق: ۷۔

۲۔ سنن ابو داؤد، کتاب الزکاۃ، باب زکاۃ السائمۃ ؛ جامع ترمذی، ابواب الزکاۃ، باب ما جاء فی زکاۃ البقر؛ سنن نسائی، کتاب الزکاۃ باب زکاۃ البقر۔

۳۔ سورۃ التوبہ: ۲۹۔

۴۔ مثال کے طور پر دیکھئے حنبلی فقہ کی کتاب: مطالب أولی النھی بشرح غایۃ المنتھی، جلد ۲، صفحہ ۵۹۶۔

۵۔ الحضارۃ الاسلامیۃ، ج ۱، ص ۶۰۔

۶۔ مثال کے طور پر دیکھئے ابنِ ابی زید، الرسالۃ مع شرحھا لابن ناجی و زروق، ج ۱، ص ۳۳۱ اور مابعد کے صفحات جہاں جزیہ کو ابوابِ زکوٰۃ کے درمیان رکھا گیا ہے۔

۷۔ عبدالکریم زیدان، أحکام الذمیین والمستأمنین فی الاسلام، ص ۱۵۵۔ اسکے علاوہ دیکھئے: بلاذری، فتوح البلدان، ص ۱۸۷، اسکے مطابق ابوعبیدہ کے نمائندے نے عیسائی جراجمہ کے ساتھ اس شرط پر صلح کی کہ وہ لوگ جنگ میں مسلمانوں کے دشمنوں کے خلاف مدد کریں گے اور مسلمان ان سے جزیہ نہیں لیں گے۔

۸۔ ص ۷۰ سے ۷۱۔

۹۔ ابوالحسن علی الماوردی، الأحکام السلطانیۃ :(قاہرہ: مصطفی البابی الحلبی، ۱۹۷۳ء) ص ۱۴۵۔

۱۰۔ علی بن الحسن ابن عساکر، تاریخ دمشق الکبیر (بیروت: دار إحیاء التراث العربي، ۲۰۰۱ء) ج ۲، ص ۱۲۵۔

۱۱۔ کتاب الأموال، ص۵۳۳۔

۱۲۔ أیضا، ص ۵۲۸ سے ۵۲۹۔

۱۳ أیضا، ص ۵۳۱۔

۱۴۔ أیضا، ص ۵۳۱ سے ۵۳۲۔

۱۵۔ أیضا، ص۵۳۴ سے ۵۳۵۔

۱۶۔ شمس الدین السرخسی، کتاب المبسوط ج ۲، ص ۱۹۹۔

۱۷۔ شرح العنایة علی الهدایة، ج۱، ص ۵۳۲

۱۸۔ ابوالأعلیٰ المودودی: حقوق أهل الذمة فی الدولة الاسلامیة، دار الفکر، ص۲۵۔

۱۹۔ أحکام الذمیین والمستأمنین فی الاسلام، ص ۱۸۶۔

۲۰۔ سورۃ المائدہ: ۴۹۔

۲۱۔ سورۃ المائدہ: ۴۲۔ اسی بنیاد پر ذمیوں کے لیے الگ عدالتیں موجود تھیں کہ وہ چاہیں تو ان سے رجوع کریں ورنہ اسلامی عدالتوں سے۔ ایڈم متز رقمطراز ہے: ''چونکہ شریعتِ اسلامی صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص تھی اس لیے اسلامی ریاست غیرمسلموں اور انکی مخصوص عدالتوں کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کرتی تھی۔ ان عدالتوں کے بارے میں ہمیں فقط اس قدر معلوم ہے کہ یہ کلیسائی عدالتیں تھیں جن کے سربراہ پادری حضرات ہی ہوا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے قانونی موضوعات پر بیشمار کتابیں تحریر کیں جو نہ صرف شادی بیاہ اور میراث وغیرہ کے امور بلکہ عیسائیوں کے ساتھ خاص ایسے بے شمار قانونی معاملات کو زیرِ بحث لاتیں جنکا اسلامی ریاست سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔ چونکہ ذمی کو اسلامی عدالتوں سے رجوع کرنے کی بھی اجازت تھی لیکن کلیسا

اسے ناپسند کرتا تھا لہذا ٹیموتیوس (۸۰۰ ع) نے مسیحی عدالتی احکام کے متعلق ایک کتاب تصنیف کی (تا کہ کسی عیسائی کے لیے اسلامی عدالت سے رجوع کرنے کے لیے مسیحی قوانین کے فقدان کا عذر باقی نہ رہے)" وہ مزید کہتے ہیں، "سنہ ۱۲۰ ھجری (۷۳۸ء) میں ابن نعیم مصر کے قاضی بنے۔ ان کا معمول تھا کہ مسلمانوں کے قضیے مسجد میں نمٹاتے جبکہ عصر کے بعد مسجد کے دروازے پر عیسائیوں کے درمیان فیصلے کرتے۔۔۔ ان کے بعد قاضیوں نے عیسائیوں کے لیے ایک دن مخصوص کر دیا جب وہ عدالتوں میں حاضر ہو جاتے۔۔۔ یہاں تک کہ قاضی محمد بن مسروق نے سنہ ۱۷۷ میں مصر کا عہدۂ قضاء سنبھالا تو انہوں نے پہلی مرتبہ عیسائیوں کو مساجد میں داخلے کی اجازت دی۔"

اس کے بعد متز کہتے ہیں" جہاں تک اندلس کا تعلق ہے تو ہم قابلِ اعتماد مصادر کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کے عیسائی اپنے فیصلے خود کرنا پسند کرتے اور قتل کے معاملات کے علاوہ کبھی قاضی سے رجوع نہ کرتے"۔

۲۲۔ "اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اسکی سند میں لیثؒ کے کاتب عبداللہ بن صالح بھی ہیں، عبدالملک بن سعید انکے متعلق کہتے ہیں: وہ ثقہ اور مامون ہیں، البتہ ایک گروہ نے انہیں ضعیف قرار دیا ہے۔ اس روایت کے باقی رجال ثقہ ہیں" ہیثمی، مجمع الزوائد، ج ۶، ص ۱۳۔

باب سوم

بے مثال رواداری

دینی وفکری رواداری کے مختلف درجے ہیں۔ رواداری کا ادنیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ آپ دوسرے کو دین اور عقیدے کی آزادی دے دیں اور اسے اپنے دین میں زبردستی داخل ہونے پر مجبور نہ کریں کہ انکار کی صورت میں اسے جان ومال سے ہاتھ دھو بیٹھنے، تشدد یا جلاوطنی جیسی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑے، جیسا کہ متعصب لوگوں کا اپنے دینی مخالفین کے ساتھ وطیرہ رہا ہے۔

اوسط درجے کی رواداری یہ ہے کہ آپ دوسرے کو اسکے اختیار کردہ دین و مذہب میں اعتقاد رکھنے دیں اور پھر اسے نہ تو کوئی ایسا کام ترک کرنے پر مجبور کریں جسے وہ ضروری سمجھتا ہے اور نہ کوئی ایسا کام کرنے پر جسے وہ حرام اور ناجائز سمجھتا ہو۔ مثلاً اگر کوئی یہودی ہفتے کے دن کام کرنا ممنوع سمجھتا ہو تو اسے کام پر مجبور نہ کیا جائے کیونکہ وہ شخص ایسا کرتے ہوئے اپنے مذہب کی مخالفت محسوس کرے گا۔(۱) اور اگر کوئی عیسائی اتوار کو کلیسا میں جانا ضروری خیال کرتا ہو تو اسے ایسا کرنے سے روکا نہ جائے۔

اس سے بھی بلندتر درجہ یہ ہے کہ ہم دوسروں پر ان امور میں بھی سختی نہ کریں جنہیں وہ اپنے دین ومذہب میں تو حلال تصور کرتے ہیں مگر ہمارے ہاں وہ حرام ہیں۔ ذمیوں کے ساتھ یہ سلوک کرنے کے باعث مسلمان رواداری کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے ہر اس چیز کا احترام کیا جس کو غیر مسلم اپنے دین کے مطابق حلال سمجھتے تھے اور ان کے لیے اس میں بہت گنجائش رکھی اور ان کی روک ٹوک اور ممانعت نہیں کی حالانکہ ریاستی قانون اور مذہب کا خیال کرتے ہوئے وہ ان چیزوں کو اس طرح حرام قرار دے

سکتے تھے کہ ان پر تعصب کی کوئی تہمت بھی لگنے نہ پائے۔ کیونکہ جس چیز کو کوئی دین" حلال" قرار دیتا ہے اس کا استعمال اس کے ماننے والوں پر" فرض "نہیں ہوتا چنانچہ اگر مجوسی کا مذہب اسے اپنی ماں یا بہن سے نکاح کرنے کی اجازت دیتا ہے تو اسکے لئے ممکن ہے کہ وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہوئے بغیر کسی اور سے شادی کر لے۔ اور اگر ایک عیسائی کا مذہب سور کھانا حلال قرار دیتا ہے تو وہ شخص ساری زندگی سور کا گوشت کھائے بغیر رہ سکتا ہے کیونکہ گائے، بکریوں اور پرندوں کے گوشت کی صورت میں اسکے لیے وسیع گنجائش موجود ہے۔

یہی صورتِ حال شراب کی بھی ہے اگر کچھ مسیحی کتب نے درستگیٔ معدہ کے لئے اس کی قلیل مقدار کو جائز قرار دیا ہو تو بھی شراب پینا ایک مسیحی کے دینی فرائض میں داخل نہیں۔ لہذا اگر اسلام ذمیوں سے یہ مطالبہ بھی کرتا کہ وہ مسلمان بھائیوں کے احساسات کا خیال کرتے ہوئے محرم عورتوں سے شادی نہ کریں، شراب نہ پئیں ،اور سور کھانا ترک کردیں تو اس میں ان لوگوں پر کوئی تنگی نہ ہوتی۔ کیونکہ ان اشیاء سے انکا احتراز نہ تو کسی منکرِ دینی کا ارتکاب ہوتا اور نہ ہی کسی مقدس فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی کے مترادف۔ اس کے باوجود اسلام نے ایسا نہیں کیا اور غیر مسلم جن چیزوں کے حلال ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے انکے متعلق انہیں تنگ کرنا پسند نہیں کیا بلکہ مسلمانوں سے کہہ دیا گیا کہ ان لوگوں کے اعتقادات سے تعرض نہ کرو۔

مسلم رواداری کی روح

اس کے علاوہ ایک چیز ایسی ہے جو وضع کردہ قوانین کے ذریعے عطا کیے جانے والے ان حقوق کے دائرے میں نہیں آتی جن کے تلف ہونے پر قانونی چارہ جوئی کی جا سکتی ہے اور جن کی ادائیگی کی نگرانی حکومتیں خود کیا کرتی ہیں۔ یہ شے رواداری کی وہ روح ہے جو حسن معاشرت ،نرمی پڑوسیوں کا خیال رکھنے ، نیکی، رحمت اور احسان جیسے انسانی

احساسات و جذبات کی وسعت و فراخی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے ۔ اور یہ ایسے امور ہیں جن پر روز مرہ زندگی کا دارومدار ہے قانون اور عدالتی کاروائیاں ان کی حفاظت کے لیے کافی نہیں ۔ یہ روح غیر اسلامی معاشروں میں بمشکل ہی پائی جاتی ہے۔

یہ رواداری درجِ ذیل قرآنی آیات میں ظاہر ہوتی ہے:

اپنی اولاد کو شرک کی دعوت دینے والے مشرک والدین کے متعلق: ﴿دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ﴾(۲)

اس کے علاوہ مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے والے مخالفوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے کی قرآنی ترغیب ﴿اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔﴾ (۳)

اور اللہ کے نیک بندوں کی تعریف میں نازل ہونیوالی آیت: ﴿اور اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں﴾(۴)

خیال رہے کہ جس زمانے میں یہ آیت نازل ہوئی اس وقت قیدی صرف مشرکوں میں سے ہی ہوا کرتے تھے۔

مشرک رشتہ داروں اور پڑوسیوں کی مالی مدد کرنے کی مشروعیت کے متعلق کچھ مسلمانوں کے اندیشوں کے جواب میں نازل شدہ آیت: ﴿اے نبی لوگوں کو ہدایت بخش دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ ہدایت تو اللہ جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔﴾ (۵)

امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد اور ان کے فقہی مذہب کے مدوّن امام محمد بن حسن الشیبانی روایت کرتے ہیں کہ قحط کے دوران نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام تکلیفوں کے باوجود جو آپ اور آپ کے صحابہ نے اہل مکہ کے ہاتھوں اٹھائی تھیں اہلِ مکہ کو کچھ مال بھجوایا تاکہ وہ اپنے غربا میں تقسیم کرسکیں۔(٦)

احمدالشیخان نے اسماء بنتِ ابی بکر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: قریش کے صلح کرنے پر میری والدہ بھی آئیں۔میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور ان سے پوچھا،''یارسول اللہؐ میری ماں آئی ہیں اور وہ رغبت رکھتی ہیں۔کیا میں ان سے صلۂ رحمی کا برتاؤ کروں۔'' آپؐ نے فرمایا:''ہاں اپنی والدہ سے صلۂ رحمی کا سلوک کرو۔''(٧)

اور ایک آیت میں قرآن نے مخالفوں کے ساتھ مباحثہ کے آداب بیان کئے ہیں۔
﴿اور اہلِ کتاب سے بحث نہ کرومگرعمدہ طریقہ سے۔۔۔سوائے اُن لوگوں کے جواُن میں سے ظالم ہوں ۔۔۔ اور ان سے کہو کہ'' ہم ایمان لائے ہیں اُس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اُس چیز پر بھی جوتم پر بھیجی گئی تھی، ہمارا خدا اورتمھارا خداایک ہی ہے اور ہم اُسی کے مسلم (فرمانبردار) ہیں۔﴾(٨)

یہ رواداری اسی طرح اہل کتاب کے ساتھ نبی ﷺ کے سلوک سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ آپؐ ان سے ملنے جاتے،ان کی تکریم کرتے، ان کے ساتھ اچھائی کرتے ،ان کے مریضوں کی عیادت کرتے ،ان سے تحائف قبول کرتے اورانہیں تحفے دیا کرتے۔

السیرۃ النبویۃ میں ابن اسحٰق نے ذکر کیا ہے کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد نبی ﷺ کی مسجد میں عصر کے وقت پہنچا۔چونکہ یہ ان کی عبادت کا وقت تھا اس لیے وہ لوگ وہیں عبادت کے لئے کھڑے ہو گئے۔صحابہ نے انہیں روکنا چاہا لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں

ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔ ان لوگوں نے مشرق کی طرف رخ کر کے اپنی عبادت کی۔(۹) معروف مجتہد علامہ ابن قیم نے اپنی کتاب الھدی النبوی میں اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے چند فقہی مسائل کا استنباط کیا ہے: " اول، اہل کتاب کے مسلمانوں کی مساجد میں داخلے کا جواز، دوم، اگر مسلمانوں کی موجودگی میں اہل کتاب کی عبادت کا وقت آ جائے تو ان کو اسکی اجازت ہوگی البتہ یہ سہولت انہیں عام حالات میں نہیں دی جائے گی"۔(۱۰)

ابوعبید نے کتاب الاموال میں سعید بن المسیب سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی گھرانے کو صدقہ ادا کیا جو کہ انہیں (آپؐ کی وفات کے بعد بھی) دیا جاتا تھا۔(۱۱) اور بخاری نے انسؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ ایک یہودی کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو وہ اسلام لے آیا۔ پھر آپؐ (اس کے گھر سے) یہ فرماتے ہوئے نکلے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے میری وجہ سے اسے جہنم سے چھٹکارا دیا۔

اور بخاری ہی نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب وفات پائی تو آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے پاس آپ کے اہل وعیال کے نفقہ کے عوض رہن تھی حالانکہ (اگر آپ چاہتے تو) اپنے اصحاب سے قرض لے سکتے تھے کہ وہ آپ کے ساتھ کسی چیز کے متعلق بخل سے کام نہ لیتے، مگر آپؐ اپنی امت کو تعلیم دینا چاہتے تھے۔

اس کے علاوہ نبی ﷺ نے غیر مسلموں سے تحائف قبول فرمائے، جنگ و امن میں ان سے مدد طلب کی تاکہ ان کی دوستی کو یقینی بنایا جائے اور کسی بدسلوکی یا فریب کا کھٹکا نہ رہے۔ آپؐ کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہو گئے۔ آپ کو بتلایا گیا کہ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ تھا جس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا" کیا یہودی انسان نہیں؟"

اسی طرح یہ رواداری غیر مسلموں کے ساتھ صحابہ اور تابعینِ کرام کے سلوک میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک یہودی اور اس کے اہل خانہ کو بیت المال سے مستقل وظیفہ دینے کا حکم جاری کرتے ہوئے فرمایا" اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ ﴿صدقات فقراء اور مساکین کے لئے ہیں﴾(۱۲) اور یہ شخص اہل کتاب کے مساکین میں سے ہے۔(۱۳)

وہ اپنے شام کے سفر کے دوران جذام میں مبتلا کچھ عیسائیوں کے پاس سے گزرے تو مسلمانوں کے بیت المال سے ان کی کفالت کا حکم دیا۔ اگرچہ حضرت عمر نے ایک مجوسی ذی ابولولو کے وار سے وفات پائی پھر بھی یہ بات انہیں بستر مرگ پر بھی آئندہ خلیفہ کو وصیت کرنے سے روک نہ سکی کہ:"میں اپنے خلیفہ کو ذمیوں کے ساتھ بھلائی کی وصیت کرتا ہوں کہ وہ ان کے ساتھ کیا گیا عہد پورا کرے، ان کے دشمنوں سے جنگ کرے اور انہیں ان کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہ کرے"۔(۱۴)

اور عبداللہؓ بن عمرو اپنے غلام کو قربانی کا گوشت اپنے یہودی ہمسائے کو دینے کی نصیحت کرتے ہیں اور یہ ہدایت اتنی مرتبہ دہراتے ہیں کہ غلام حیرت سے یہودی ہمسائے کا اسقدر خیال کرنے کا سبب دریافت کرتا ہے۔ ابن عمرو جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:" جبریل مجھے اس وقت تک ہمسائے سے بھلائی کی تاکید کرتے رہے کہ مجھے گمان ہوا کہ کہیں اسے وراثت میں بھی حصہ دار نہ بنا دیں۔ (۱۵)

جب ام حارث بن ابی ربیعہ کا نصرانیت کی حالت میں انتقال ہوا تو اصحابِ نبی ﷺ اس کے جنازے کے ساتھ گئے۔(۱۶) اسی طرح بعض اجل تابعین صدقہ فطر سے عیسائی راہبوں کو دینے میں کوئی برائی محسوس نہ کرتے بلکہ کچھ لوگ مثلاً عکرمہ، ابن سیرین اور زہری تو ان لوگوں کو زکوۃ میں سے دینے کے جواز کے بھی قائل ہیں۔ ابن ابی شیبہ نے جابر بن زید سے روایت کیا کہ ان سے صدقہ کے متعلق دریافت کیا گیا(کہ کن لوگوں پر خرچ کیا

جائے) تو انہوں نے جواب دیا: ''اپنی ملت کے مسلمان اور ذمی افراد پر''۔(۱۷)

قاضی عیاض نے ترتیب المدارك میں دار قطنی کی روایت کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ قاضی اسماعیل بن اسحاق (۱۸) کے پاس عیسائی وزیر عبدون بن صاعد آیا تو انہوں نے کھڑے ہوکر اسکا استقبال کیا اور جب اس بارے میں حاضرین کو متعجب پایا تو وزیر کے جانے کے بعدان سے مخاطب ہوکر کہا: ''تمھیں تعجب کیوں ہوا جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معالے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے﴾(۱۹) جبکہ یہ شخص مسلمانوں کی حاجت روائی کرتا اور ہمارے اور معتضد کے درمیان سفیر کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ اور یہ ایک نیکی ہے۔(۲۰)

پھر یہ رواداری کی بات کئی ائمہ اور فقہاء کی جانب سے ذمیوں کے دفاع کرنے اور ان کی عصمتوں کو مسلمانوں کی عصمتوں کی مانند خیال کرنے سے بھی عیاں ہوتی ہے۔ ہم اس باب میں مثال کے طور پر امام اوزاعی اور امام ابنِ تیمیہ کے مواقف ذکر کر چکے ہیں۔

یہاں ہم مایۂ ناز فقیہ، ماہرِ اصول فقہ اور محقق شہاب الدین قرافی کے ان روشن الفاظ کے اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں جو وہ (برّ) کی شرح میں، جس کا غیر مسلموں کے معالے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، تحریر فرماتے ہیں: ''کمزور غیر مسلموں سے نرمی کا برتاؤ، ان کے فقیروں کی حاجت روائی، ان کے بھوکوں کو کھانا کھلانا، ان کے بے لباسوں کو لباس پہنانا، ان کے ساتھ لطف و رحمت، نہ کہ خوف و ذلت کے باعث، نرم کلای کرنا، ان کی ہمسائیگی میں پیش آنیوالی کوئی بھی تکلیف، بوجہ نرمی نہ کہ کسی خوف یا لالچ کی بنیاد پر اور ازالے پر قدرت کے باوجود، برداشت کرنا، ان کے لئے ہدایت پانے اور اہل سعادت میں شامل ہونے کی دعا کرنا، دینی و دنیاوی تمام امور میں ان کی خیر خواہی کرنا، اگر کسی کو ان

سے ایذا پہنچے توان کے عیوب کی پردہ پوشی کرنا، ان کے اموال،عصمتوں، تمام حقوق و مصالح کی حفاظت اورازالہء ظلم میں ان سے تعاون اور انہیں انکے تمام حقوق دلوانا۔۔۔الخ۔‘‘(۲۱)

مسلم رواداری کی فکری اساس

دوسرے ادیان کے پیروؤں کے ساتھ مسلمانوں کی رواداری ان نظریات اور خالص حقائق پر مبنی ہے جن کا بیج اسلام نے مسلمانوں کے قلوب و اذہان میں بویا تھا۔ ان میں سے اہم ترین درجِ ذیل ہیں :

۱۔ دینی، جنسی یا نسلی اختلافات سے قطع نظر ہر انسان کی عظمت پر تمام مسلمانوں کا ایمان:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی﴾(۲۲) یہ حتمی عظمت ہر انسان کو احترام اور رعایت کا مستحق بناتی ہے۔

جو کچھ ہم نے اس سے پہلے ذکر کیا ہے اس کی ایک عملی مثال امام بخاری کی روایت کردہ اس حدیث میں ملتی ہے جس میں جابر بن عبداللہ نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ کے سامنے سے ایک جنازہ لے جایا گیا تو آپؐ اس کے لئے (احتراماً) کھڑے ہو گئے۔ آپؐ سے کہا گیا : ’’یارسول اللہ! یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے‘‘۔ آپؐ نے جواباً ارشاد فرمایا ’’کیا یہ انسان نہیں؟‘‘۔ بے شک اسلام میں ہر انسان کے لیے حرمت اور (بڑی) جگہ ہے۔ دیکھئے نبی ﷺ نے کیسا عظیم موقف اختیار فرمایا اور اسکی کیا ہی زبردست توجیہ پیش کی۔

۲۔ مسلمانوں کا یہ اعتقاد کہ انسانوں میں متعدد ادیان کا وجود اللہ تعالیٰ کی مشیت کے عین مطابق ہے کہ اس نے اپنی مخلوقات کو اس سلسلے میں آزادی اور اختیار عنایت کیا ہے۔

پس ﴿جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کردے﴾ (۲۳) اور ﴿بیشک تیرا رب اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا مگر اب تو وہ مختلف طریقوں پر ہی چلتے رہیں گے﴾(۲۴)

ایک مسلمان اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اللہ کی مشیت کو کوئی ٹالنے والا نہیں۔ جس طرح کہ اللہ صرف اسی بات کا ارادہ کرتا ہے جس میں بھلائی اور حکمت ہو، قطع نظر اس سے کہ لوگوں کو یہ حکمت معلوم ہو سکے یا وہ اس سے بے خبر رہیں۔ اس لئے مسلمان کبھی تمام انسانوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنے کا خیال اپنے دل میں نہیں لاتا۔ وہ ایسا کر بھی کیسے سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کریمؐ سے فرمادیا۔ ﴿اگر تیرا رب چاہتا (کہ زمین میں سب مومن و فرمانبردار ہی ہوں) تو سارے اہلِ زمین ایمان لے آئے ہوتے۔ پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں؟﴾(۲۵)

۳۔ مسلمان کافروں کا ان کے کفر پر محاسبہ کرنے یا گمراہوں کو ان کی گمراہی کی سزا دینے کا مکلّف نہیں اور نہ ہی یہ حق اسے حاصل ہے اور اس کا وقتِ مقرر یہ دنیا بھی نہیں۔ بے شک ان لوگوں سے حساب لینا یوم قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ﴿اگر وہ تم سے جھگڑیں تو کہہ دو: جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ کو خوب معلوم ہے اللہ قیامت کے روز تمھارے درمیان ان سب باتوں کا فیصلہ کردے گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو﴾(۲۶)

اور اپنے رسول کو اہل کتاب کے بارے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا: اب تم اُسی دین کی طرف دعوت دو، اور جس طرح تمھیں حکم دیا گیا ہے اُسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ، اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ان سے کہہ دو کہ ﴿اللہ نے جو کتاب نازل کی ہے میں اُس پر ایمان لایا، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں، اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے

ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے۔ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں اللہ ایک دن ہم سب کو جمع کرے گا اور اُسی کی طرف ہم سب کو جانا ہے﴾(۲۷)

۴۔ مسلمان کا اس بات پر ایمان کہ اللہ عدل کا حکم دیتا، انصاف کو پسند کرتا اور سب انسانوں حتیٰ کہ مشرکین کے ساتھ بھی اخلاقِ حسنہ کے ساتھ پیش آنے کی دعوت دیتا ہے، نیز یہ کہ وہ ظلم کو ناپسند کرتا اور ظالموں کو سزا دیتا ہے اگر چہ ظلم کرنے والا مسلمان اور مظلوم کوئی کافر ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے﴾(۲۸) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

﴿مظلوم کی دعا اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں اگر چہ مظلوم کافر ہی کیوں نہ ہو﴾(۲۹)

حوالہ جات

۱۔ حنابلہ کی ایک معروف کتاب غایۃ المنتھی کے مطابق ''چونکہ ایک یہودی کو سبت کے دن کام پر طلب کرنا حرام ہے اور اسکی نسبت سے یہ حرمت باقی ہے اس لیے اجارہ وغیرہ میں اسے کام سے شرعی طور پر مستثنیٰ کیا جائے گا۔ یہ بات سنن نسائی اور جامع ترمذی میں مروی اس حدیث کی بنیاد پر ہے: ''اور تمہارے لیے اے یہودیو! ضروری ہے کہ سبت کے بارے میں حد سے تجاوز نہ کرو' ترمذی کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ اسراء، امام ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ دیکھئے مطالب أولی النھایۃ بشرح غایۃ المنتھی، ج ۷، ۲۱۴۔

۲۔ سورۃ لقمان: ۱۵۔

۳۔ سورۃ الممتحنۃ: ۸۔

۴۔ سورۃ الدھر: ۸۔

۵۔ سورۃ البقرۃ: ۲۷۲۔

۶۔ شرح السیر الکبیر، ج ۱، ص ۷۰۔

۷۔ ابنِ کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج ۸، ص ۹۰۔

۸۔ سورۃ العنکبوت: ۴۶۔

۹۔ بروایت ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ (بیروت: دار الفکر، ۱۹۹۲ء) ص ۴۱۵۔

۱۰۔ شمس الدین ابن قیم الجوزیۃ، زاد المعاد، (بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۹۹۴ء) ج ۳، ص ۶۳۸۔

۱۱۔ الأموال، ص ۶۱۳۔

۱۲۔ التوبہ: ۶۰۔

۲۴۔ سورۃ ھود: ۱۱۸۔

۲۵۔ سورۃ یونس: ۹۹۔

۲۶۔ سورۃ الحج: ۶۸ سے ۶۹۔

۲۷۔ سورۃ الشوریٰ: ۱۵۔

۲۸۔ سورۃ المائدہ: ۸۔

۲۹۔ اسے امام احمد نے مسند میں روایت کیا ہے۔ج ۳، ص ۱۵۳۔

۲۴۔ سورۃ ھود: ۱۱۸۔

۲۵۔ سورۃ یونس: ۹۹۔

۲۶۔ سورۃ الحج: ۶۸ سے ۶۹۔

۲۷۔ سورۃ الشوریٰ: ۱۵۔

۲۸۔ سورۃ المائدہ: ۸۔

۲۹۔ اسے امام احمد نے مسند میں روایت کیا ہے۔ ج ۳، ص ۱۵۳۔

باب چہارم

تاریخ کی گواہی

اکثر دیکھا گیا ہے کہ نہایت عمدہ قوانین ،منصفانہ احکام اور اعلیٰ و ارفع اصول وضع تو کر لئے جاتے ہیں لیکن ان کی حیثیت کاغذ پر لکھے ہوئے حروف سے زیادہ نہیں ہوتی کہ نہ تو کسی کو ان کے نفاذ کی فکر ہوتی ہے اور نہ اربابِ اختیار ہی ان کی پروا کرتے ہیں۔

لیکن اسلامی قوانین و مبادی کا خاصہ ہے کہ وہ ربّانی بنیادوں پر قائم دینی قوانین ہیں چنانچہ جو قبولِ عام انہیں حاصل ہوا ہے وہ انسانوں کے وضع کردہ کسی قانون کے حصے میں نہیں آیا۔ چنانچہ مختلف زمانوں اور علاقوں میں امتِ مسلمہ کی تاریخ رواداری کے اعلیٰ ترین مظاہروں سے بھری پڑی ہے رواداری بھی ایسی کہ عرصے تک تلاش میں سرگرداں رہنے کے باوجود لوگوں کو دنیا میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔

زیرِ نظر بحث کے دوران اس عظیم تاریخ کی ایسی کئی روشن مثالیں ہماری نظر سے گزریں جن میں ہم نے اسلامی رواداری کے مفہوم کی وسعت ،روح اور اسکی فکری ونظریاتی اساس ملاحظہ کی۔ خلفائے راشدین کے عدل و رواداری کا کافی ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے البتہ اموی و عباسی حکومتوں کے دوران ذمیوں سے سلوک کے متعلق ایک نئے باب کا اضافہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی رواداری کی جو مثالیں ہم نے ملاحظہ کیں ان پر ہمارا ایمان بڑھ جائے۔

میں اموی دورِ حکومت کے متعلق وِل ڈیوران کی کتاب قِصّة الحضارة سے درج

ذیل سطور نقل کر دینے پر اکتفا کروں گا۔ موصوف لکھتے ہیں ’’مسیحی، زرتشتی، یہودی اور صابی مذاہب سے تعلق رکھنے والے ذمیوں کو اموی دور میں اس درجہ کی رواداری حاصل تھی کہ اس کی مثال ہمیں اُس زمانے کے مسیحی ملکوں میں نہیں ملتی۔ چنانچہ وہ لوگ اپنے دینی شعائر پر عمل کرنے میں بالکل آزاد تھے اور انکے کلیسا اور معابد انکی اپنی تحویل میں تھے۔ ان پر ایک خاص رنگ کا لباس پہننے اور ہرفرد پر اس کی آمدنی کے مطابق ایک سے چار دینار تک کے ایک ٹیکس علاوہ کوئی پابندی نہ تھی اور یہ ٹیکس بھی ہتھیار اٹھانے کے قابل غیر مسلموں کے علاوہ کسی سے وصول نہ کیا جاتا جبکہ اس کی ادائیگی راہبوں، خواتین، نابالغ مردوں، غلاموں، بوڑھوں، معذوروں، مفلسوں کو معاف تھی اور اس ٹیکس کے بدلے میں وہ لوگ فوجی خدمات سے مستثنیٰ قرار دیئے جاتے تھے یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ فوج میں انہیں قبول نہ کیا جاتا تھا۔ ان کی سالانہ آمدنی(۱) پر 2.5% زکوۃ بھی لاگو نہ تھی جبکہ ان کا دفاع حکومت کی ذمہ داری تھی۔ اگرچہ اسلامی عدالتوں میں ان کی گواہی قبول نہ کی جاتی لیکن انہیں ذاتی عدالتوں کی سہولت میسر تھی جن میں انہیں صرف اپنے مذہبی رہنماؤں، قاضیوں اور قوانین ہی کی اطاعت کرنا پڑتی۔‘‘(۲)

اسلامی تہذیب کے دورِعروج یعنی دورِعباسی میں ذمیوں کے مقام کے متعلق ڈاکٹر خربوطلی کی کتاب الاسلام و أهل الذمة (۳) سے اقتباس ہمارے لیے کافی ہے کیونکہ اپنی رائے انھوں نے بنیادی تاریخی مصادر یا خود مستشرقین کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے قائم کی ہے، وہ لکھتے ہیں: ’’دورعباسی میں بہت سے ذمیوں نے شہرت حاصل کی۔ مثلاً پہلے عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور کے ذاتی طبیب جرجیس بن بختیشوع جس پر خلیفہ بہت

زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ہارون الرشید نے اپنے طبیب جبرائیل بن بختیشوع کے متعلق کہہ رکھا تھا:'' حاجت مندوں کو چاہیے کہ جبرائیل کے ذریعے مجھ تک اپنی درخواستیں پہنچائیں کیونکہ میں اسکی بات رد نہیں کرتا''۔ جبرائیل کی ماہانہ تنخواہ دس ہزار درہم تھی۔ انھی لوگوں میں سے ایک ماسویہ بھی تھا جس کا سالانہ وظیفہ الرشید نے مقرر تو ہزار درہم کیا لیکن ہر سال اسے بیس ہزار زیادہ دے دیا کرتا۔

اے ایس ٹریٹن مسلمانوں کی رواداری کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔'' مسلمان مصنفین ومورخین ان غیر مسلموں کے احسانات کی قدر شناسی میں فیاض رہے ہیں۔ چنانچہ وہ حنین بن اسحٰق کو اپنے زمانے کا رئیس الأطباء اور هبة الله بن تلميذ کو بقراط و جالینوس کے القاب سے یاد کرتے ہیں''۔(۴)

خلیفہ متوکل کا منظورِ نظر بختیشوع بن جبرائیل اپنے لباس، خوشبوؤں کے استعمال، مالی آسودگی ،نخوت اور لونڈی غلاموں کی تعداد میں خلیفہ سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ جب سلمویہ بیمار پڑا تو معتصم باللہ نے اس کی عیادت کے لئے اپنے بیٹے کو بھیجا اور وفات کے بعد اس کا جنازہ محل میں لایا گیا اور نصاریٰ کے رواج کے مطابق شمعوں اور دھونیوں میں اس کی آخری رسومات ادا کی گئیں اور اس دن معتصم نے غم کے مارے کھانا نہیں کھایا۔

''یوحنا بن ماسویہ نے تو ہارون الرشید سے المتوکل تک عباسی خلفاء کی خدمت کی اور ان کے کھانے کی محفلوں سے کبھی غیر حاضر نہیں رہا اور وہ بھی اس کے بغیر کبھی کھانا شروع

نہ کرتے۔ خلیفہ المتوکل اس کے ساتھ ہنسی مذاق کیا کرتا۔ ان کے تعلقات میں کبھی کوئی اونچ نیچ نہیں آئی۔"

بہت سے ذمیوں نے علوم وفنون کے میدان میں بھی نام کمایا۔ ٹریٹن نے لکھا ہے،

"پہلی اور دوسری صدی ہجری میں علوم وفنون کے میدان میں اپنی رعایا کے ساتھ عربوں کے تعلقات نہایت اچھے اور خوشگوار رہے جس کی کئی مثالیں اس دور کے بعد بھی سامنے آتی رہیں۔ مسلم حکومت نے کئی غیر مسلم انجینئر اور دوسرے ماہرین بھی تیار کیے۔ بہت سے ذمیوں نے مسلم فقہاء و مدرسین سے تعلیم حاصل کی مثلاً حنین بن اسحاق نے الخلیل بن احمد اور سیبویہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور عربی زبان میں کامل مہارت حاصل کر لی۔" (۵)

اسی طرح منطق میں اپنے زمانے کے سب سے لائق شخص یحیی بن عدی بن حمید نے فارابی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ثابت بن قرہ نے معتزلی عالم علی بن الولید سے تعلیم حاصل کی اور کچھ ہی عرصہ بعد اسلام قبول کر لیا۔ وہ نہایت خوش خط اور ماہر ادیب تھا اور اس کی تصانیف اسکی فکری گہرائی کا ثبوت ہیں۔ (۶)

ذمیوں کے ساتھ عباسیوں کی رواداری کی مثالیں دیتے ہوئے ٹریٹن نے لکھا ہے۔ "ابراہیم بن ہلال ان اعلی ترین مناصب تک پہنچا جو ایک ذمی حاصل کر سکتا ہے۔ شاعروں نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے اور عز الدولۃ بویہی نے اسے پیشکش کی کہ اگر وہ اسلام قبول کر لے تو اسے وزیر بنا دیا جائے گا، لیکن وہ نہ مانا۔ ابراہیم بن ہلال مسلمانوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آیا کرتا تھا۔ دینی اختلاف کے باوجود صاحب بن عباد اور

شریف الرضی کے ساتھ اس کی خط و کتابت تھی اور وہ حافظِ قرآن بھی تھا"۔(۷)

مسلمان اہل قلم نے ادیان و مذاہب کے مطالعے پر بہت توجہ دی۔ چنانچہ ابن حزم اندلسی (۱۰۵۶ء/۴۵۶) کو انجیل اور مسیحی علم الکلام میں مکمل مہارت حاصل تھی۔ اسی طرح ابنِ خلدون نے انجیل کے مطالعے اور کلیسا کے انتظامی معاملات کی مکمل معلومات حاصل کیں اور ان میں سے کچھ کا ذکر اپنے مقدمے میں بھی کیا۔(۸) قلقشندی کے خیال میں ایک مؤرخ کے لئے ذمیوں کے تہواروں کا جاننا ضروری ہے۔(۹) مقریزی نے یہود و نصاریٰ کے تہواروں کے متعلق کئی تفصیلات کا ذکر اور ان کے مختلف فرقوں کے متعلق گفتگو کی ہے اور اسکندریہ کے بطریقوں کے نام گنوائے ہیں ۔(۱۰) القزوینی اور المسعودی دونوں نے ذمیوں کے فرقوں کے متعلق گفتگو کی ہے۔(۱۱)

مسلم حکام کی رواداری کے اعتراف میں ٹریٹن نے لکھا ہے "مسلم حکام کا سلوک مجموعی طور پر ان قوانین سے بہتر تھا جنہیں ذمیوں پر لاگو کرنے کے وہ پابند تھے۔ عرب علاقوں میں نئے کلیساؤں اور معبدوں کی تعمیر اس کا واضح ترین ثبوت ہے۔ سرکاری محکموں نے یہود و نصاریٰ کے معاملات میں کبھی مداخلت نہ کی۔ بلکہ یہ لوگ بعض اوقات اعلیٰ اور اہم ترین مناصب پر فائز ہوئے اور انہوں نے بہت زیادہ مال و دولت جمع کی۔ دوسری طرف مسلمانوں میں مسیحی تہواروں میں شرکت کا رواج عام ہو چکا تھا۔"(۱۲)

حوالہ جات

۱۔ زکوٰۃ سالانہ آمدنی پر نہیں بلکہ نمو پذیر سرمائے پر کاٹی جاتی ہے اور آمدنی کے ساتھ اسکا کوئی تعلق نہیں جیسا کہ نقود و تجارت کی زکوٰۃ۔ اور زکوٰۃ کی بعض قسموں، مثلاً زراعت سے حاصل ہونے والی آمدنی کی شرح سیرابی کی نوعیت کے لحاظ سے ۱۰٪ یا ۵٪ تک ہوتی ہے جیسا کہ فقہ میں معروف ہے۔

۲۔ ول ڈیوران، قصة الحضارة (قاہرہ: مطبعة لجنة التأليف و الترجمة و النشر، ۱۹۶۸ء) جلد ۱۳، ص ۱۳۰ سے ۱۳۱۔

۳۔ الاسلام و اهل الذمة ، ص ۱۴۵ سے ۱۴۷۔

۴۔ اے۔ ایس ٹریٹن، The Caliphs and their Non-Muslim Subjects (لندن: فرینک کاس، ۱۹۷۰)، ص ۱۵۸۔

۵۔ حوالہء سابق، ص ۱۶۷۔

۶۔ ٹریٹن کی کتاب میں یہ بات ابن جزلہ کے حوالے سے آئی ہے دیکھئے ص ۱۶۸۔ ثابت بن قرۃ کے لیے ملاحظہ ہو ابنِ ابی اصیبعہ، طبقات الأطباء (بیروت: دار الفکر، ۱۹۵۶)، ج۱، ص ۱۹۳ سے ۲۰۱۔

۷۔ ٹریٹن، کتاب مذکور، ص ۱۶۸۔ شمس الدین احمد بن محمد ابنِ خلکان، وفیات الاعیان (بیروت: دار صادر، ۱۹۰۰)، ج ۱، ص ۵۲۔

۸۔ عبد الرحمٰن ابن خلدون، المقدمة (مکة المکرمة: مصطفی احمد الباز، ۱۹۹۴)، ج۱، ص ۲۴۵ سے ۲۴۸۔

۹۔ ابو العباس احمد القلقشندی، صبح الأعشی (قاہرہ: الأمیریۃ، ۱۹۱۳ء)، ج ۲، ص ۴۰۶ سے ۴۲۹۔

۱۰۔ احمد بن علی المقریزی، کتاب الخطط المقریزیۃ (قاہرہ: مطبعۃ النیل، ۱۳۲۵ھ)، ج ۴، ص ۳۶۵ سے ۴۰۶۔

۱۱۔ علی بن حسین المسعودی، التنبیہ والاشراف (قاہرہ: دار الصاوی، ۱۹۳۸ء)، ص ۱۱۹ سے ۱۵۰۔

۱۲۔ ٹریٹن، کتابِ مذکور، ص ۲۳۱۔

بابِ پنجم

چند اعتراضات کا جائزہ

اسلامی رواداری کی ان روشن مثالوں کے باوجود بعض مستشرقین نے کچھ اعتراضات ادھر ادھر سے جمع کئے ہیں جو ان کے خیال میں اس عظیم روایت کو ناقص و بے اثر بنا دیتے ہیں ۔ حالانکہ جن واقعات کو بنیاد بنا کر یہ اعتراضات کیے گئے ہیں اگر انہیں انکی اصل توجیہ کے ساتھ اور اپنے تاریخی سیاق میں رکھ کر دیکھا جائے تو اُس عدل کی حدود سے ذرہ بھر متجاوز نہیں جس کا اسلام ذمیوں کے ساتھ اپنے تعلقات میں نہایت شدت سے آرزومند تھا۔

جزیے کا قضیہ

مسیحی منادوں اور مستشرقین کا ایک اعتراض جزیہ کے متعلق ہے۔ ان حضرات نے جزیہ کے معاملے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کے لیے نہایت بری توجیہات پیش کی ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ٹیکس تذلیل وتحقیر پر مبنی اور غیر مسلموں کے اسلام قبول نہ کرنے کی سزا کے طور پر نافذ کیا گیا تھا ۔ان لوگوں کے اس پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلم جزیہ کے نام تک سے خائف ہو گئے۔

حالانکہ ذمیوں پر لگایا جانے والا جزیہ مسلمانوں پر عائد دو فریضوں، جہاد اور زکوٰۃ کا بدل ہے جن کی دینی نوعیت کے پیش نظر غیر مسلموں کو ان کا پابند نہیں کیا گیا۔ فوجی خدمات اور مملکت کے دفاع میں شریک ہونے پر ذمیوں سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہم اپنی تصنیف فقہ الزکوٰۃ میں اس سوال سے بحث کر چکے ہیں کہ آیا ذمیوں کو مالی واجبات کی حد

تک مسلمانوں کے مساوی کردینے کے لیے ان پر زکوۃ کے مساوی ٹیکس لگایا جاسکتا ہے یا نہیں اگرچہ اس ٹیکس کا نام فریقین کے ہاں پائی جانے والی حساسیت کے پیش نظر ''زکوۃ'' یا ''جزیہ'' نہ رکھا جائے کیونکہ حضرت عمرؓ نے بنی تغلب کے نصاری سے جزیہ تالیفِ قلب کی خاطراور ناموں کوکوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے ''صدقہ'' کے نام پر وصول کیا۔(۱)

مزید وضاحت اور ہر ممکنہ اعتراض سے بچنے کے لئے میں یہاں سر تھامس آرنلڈ کی کتاب الدعوة الی الاسلام سے درج ذیل سطور نقل کرنا چاہوں گا جوانہوں نے جزیہ کی علت اور اس کی ادائیگی کے پابند افراد کے متعلق سپردِ قلم کی ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں۔(۲) ''بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عیسائیوں پر جزیہ ان کے قبول اسلام سے انکار کے باعث لگایا جاتا تھا مگر یہ خیال درست نہیں کیونکہ جزیہ کی ادائیگی میں وہ لوگ بھی دیگر ذمیوں کے ساتھ شریک تھے جو اپنے مذہب کی وجہ سے فوجی خدمت سرانجام دینے سے قاصر تھے اور جن کی حفاظت کی ذمہ داری جزیہ کے عوض مسلمان حکام پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ حیرہ کے باشندوں نے جزیہ ادا کرتے ہوئے اس بات کی خاص طور پر وضاحت کردی کہ ''مسلمان اوران کا حاکم ہمیں ظلم سے بچائے گا، خواہ ظالم مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔''(۳)

اسی طرح حیرہ کے ملحقہ کچھ علاقوں کے باشندوں کے ساتھ کئے گئے معاہدے میں خالدؓبن الولید نے لکھا ، ''اگر ہم تمہارا دفاع کریں تو جزیے کے مستحق ہونگے ورنہ نہیں''۔(۴) خلیفۂ راشد حضرت عمرؓبن الخطاب کے دور میں پیش آنیوالے واقعے سے اس طرح کی شرائط پر مسلمانوں کی رضامندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔ جب شہنشاہ ہرقل نے مسلمان فوجوں کے مقابلے کے لئے ایک بڑا لشکر جمع کرلیا تو مسلمانوں کو لازماً اپنی تمام

تر توجہ اس جنگ پر مرتکز کر دینا پڑی جس کا گھیرا ان پر تنگ ہوتا جارہا تھا۔ لیکن جب قائدِ عرب ابوعبیدہؓ بن الجراح کو لشکر کشی کی خبر ہوئی تو انہوں نے شام کے مفتوحہ علاقوں کے عاملوں کو حکم دیا کہ جو جزیہ ان علاقوں کے باشندوں سے لیا گیا انہیں لوٹا دیا جائے اور عوام کی طرف لکھا ''آپ لوگوں نے ہم پر شرط عائد کر رکھی تھی کہ ہم آپکا دفاع کریں، جس کو پورا کرنے سے موجودہ صورتحال میں ہم قاصر ہیں کیونکہ ہمیں دشمن کا لشکر اکٹھا ہونے کی خبر موصول ہوئی ہے۔ چنانچہ ہم آپ کی دولت اور جو کچھ آپ سے وصول کیا تھا آپ کو لوٹا رہے ہیں ۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں نصرت عطا فرمائی تو پھر ہم آپ کے ساتھ کئے گئے معاہدے اور اس میں شامل شرائط پر کاربند رہیں گے''۔ اس کے ساتھ ہی ریاست کے خزانے میں سے بھاری رقوم غیر مسلم رعایا کو واپس کر دی گئیں۔ اس پر مسیحیوں نے مسلم رؤساء کو برکت کی دعا دی اور کہا خدا آپ کو ہمارے پاس بخیریت واپس لائے اور اہل روم پر فتح دے کیونکہ آج اگر ہمارا پالا ان سے پڑا ہوتا تو ہمیں کچھ واپس نہ ملتا بلکہ وہ ہمارا بچا کھچا مال بھی چھین لیتے۔(۵)

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے جزیہ (ہتھیار اٹھانے پر) قدرت رکھنے والے مردوں پر اس فوجی خدمت کے معاوضے میں لگایا جاتا تھا جو انہیں مسلمان ہونے کی صورت میں کرنا پڑتی۔ اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ لشکرِ اسلام میں خدمات سرانجام دینے والا ہر عیسائی جزیئے کی ادائیگی سے مستثنیٰ تھا۔ انطاکیہ کے قریب کی ایک مسیحی آبادی جراجمۃ کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا تھا۔ وہاں کے باشندوں نے مسلمانوں کے ساتھ صلح کی اور وعدہ کیا کہ اگر ان سے جزیہ نہ لیا جائے اور مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا جائے تو وہ مسلمانوں کا ساتھ

دیں گے اور جنگوں میں انکے شانہ بشانہ لڑیں گے۔(٦)

اور جب سن ۲۲ ہجری میں اسلامی فتوحات کا رخ تیزی سے شمالی ایران کی طرف ہوا تو اسی طرح کے ایک معاہدے کی توثیق ان علاقوں کی حدود میں آباد لوگوں سے بھی کی گئی اور انہیں فوجی خدمت کے عوض جزیہ کی ادائیگی سے بری کر دیا گیا۔(۷)

جزیہ کی منسوخی کی مثالیں ہمیں ان عیسائیوں کے سلسلے میں بھی ملتی ہیں جو ترکوں کی بری یا بحری فوج میں ملازم تھے۔ مثلاً مگارس (Migaris) کے باشندے جو البانیہ کے عیسائیوں میں سے تھے اور جزیہ سے اس شرط پر مستثنیٰ قرار دیئے گئے تھے کہ مسلح آدمیوں کی ایک جماعت مہیا کریں جو جبل ستھران (M t. Ci th r on) اور گرانیہ (Geraned) کے ان دروں کی حفاظت کریں جہاں سے خاکنائے کورنتھ (Corinth) کو راستہ جاتا تھا۔ اسی طرح وہ عیسائی جو ترکی فوج کے ہراول کے طور پر کام کرتے، سڑکوں کی مرمت کرتے اور پل بناتے تھے نہ صرف خراج کی ادائیگی سے بری تھے بلکہ حکومت نے انہیں ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ اراضی سے نواز رکھا تھا۔(۸)

ہائیڈرا (Hydra) کے عیسائی بھی سلطان کو براہ راست ٹیکس ادا کرنے کی بجائے بحری بیڑے کے لئے ۲۵۰ آدمیوں کی جماعت مہیا کرتے تھے۔ جن کے تمام اخراجات مقامی خزانے سے ادا ہوتے تھے۔(۹)

جنوبی رومانیہ کے باشندے جو ارماتولی(۱۰) کہلاتے تھے اور سولہویں اور سترہویں صدی میں ترکی فوج کا ایک طاقت ور عنصر تھے، نیز مردی (Mirdites) جو البانیہ کے ایک

کیتھولک مذہب کا ایک قبیلہ تھا اور سقوطری (Scutari) کے شمالی پہاڑوں میں آباد تھا یہ سب لوگ ٹیکسوں کی ادائیگی سے اس شرط پر مستثنیٰ تھے کہ جنگ کے زمانے (۱۱) میں ایک مسلح دستہ فراہم کیا کریں گے۔ اسی اصول کے مطابق یونانی عیسائی جو ان نہروں (۱۲) کی نگرانی پر مقرر تھے جن کے ذریعے سے قسطنطنیہ میں پینے کا پانی آتا تھا۔(۱۳) یا شہر کے بارود خانے کی حفاظت پر متعین تھے (۱۴) اپنی خدمات کے صلے میں جزیہ کی ادائیگی سے بری الذمہ تھے ۔اس کے برعکس جب مصر کے مسلمان کاشتکار جب فوجی خدمت سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے تو اس کے عوض ان پر اسی قسم کا ٹیکس لگایا گیا جو عیسائیوں سے وصول کیا جاتا تھا۔''(۱۵)

یہ سب منصف مزاج مورخ تھامس آرنلڈ نے دلائل کی روشنی میں اور قابل اعتماد مراجع کے حوالے سے لکھا ہے۔

ذمیوں کی گردنوں پر لگائی جانے والی مہر

مذکورہ اعتراضات میں سے ایک اہل ذمہ کی گردنوں پر مہر کے حوالے سے ہے اور یہ صورتِ حال کی درج ذیل تصویر کشی پر مبنی ہے۔

۱۔ یہ ایک دائمی اور مسلسل نافذ کیا جانے والا قانون تھا۔

۲۔ یہ نظام مسلمانوں کی اختراع تھا۔

۳۔ یہ ذمیوں کی تذلیل کی خاطر وضع کیا گیا اور ان پر ظلم کے مترادف تھا۔

حالانکہ ان تینوں باتوں کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں جیسا کہ اہل ذمہ کے معاملے کا

گہرا مطالعہ کرنیوالے انصاف پسند مستشرق مورخین کا بیان ہے ۔ان میں ممتاز ترین مستشرق مشہور کتاب The Caliphs and their Non-Muslim Subjects کے مصنف اے ۔ایس ۔ٹریٹن ہیں ۔

جہاں تک (مذکورہ بالا باتوں میں سے) پہلی بات کا تعلق ہے تو مورخ یعقوبی کا بیان ہے کہ مہر فقط جزیہ کی وصولی کے وقت لگائی جاتی ۔اس کے بعد اسے توڑ دیا جاتا۔(۱۶) ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ "مناسب ہوگا کہ جزیہ کی وصولی کے زمانہ میں ان لوگوں کی گردنوں پر مہر لگا دی جایا کرے۔ جب سب کی پیشی ختم ہو جائے تو یہ مہریں توڑ دی جائیں۔"(۱۷)

دوسری بات کے متعلق ٹریٹن نے لکھا ہے، "انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس عیب کا ذمہ دار عربوں کو نہ ٹھہرایا جائے کیونکہ اس بارے میں وہ اپنے بازنطینی پیشرووٴں کے پیروکار تھے"۔(۱۸) تیسری بات کے متعلق ڈاکٹر علی حسن خربوطلی نے اپنی کتاب الاسلام و اھل الذمہ میں لکھا ہے(۱۹) "جزیہ کی ادائیگی کے وقت بازنطینی رومیوں کی پیروی میں گردنوں پر مہر کا طریقہ جو مسلمانوں نے اختیار کیا تشدد یا تذلیل کی علامت نہیں بلکہ یہ جاننے کا ایک ذریعہ تھا کہ ٹیکس کس نے ادا کر دیا اور کس نے نہیں۔خصوصاً چونکہ اس وقت طباعت تھی نہیں لہذا جزیہ کی ادائیگی ثابت کرنے والی اور جعلسازی کے امکانات سے مبرا رسیدیں بنانا اس وقت ممکن نہ تھا ۔اسی لئے بعض ایشیائی اور افریقی ممالک بیسویں صدی میں انتخابات میں یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ ووٹ دہندگان کے ہاتھوں پر ایک طرح مہر لگا دی جاتی ہے تا کہ کوئی شخص ایک سے زیادہ مرتبہ ووٹ نہ ڈال سکے اور یہ مہر دو تین ایام سے پہلے ہاتھوں سے زائل نہیں ہوتی ۔

ذمیوں کے لیے لباس کی تخصیص

مستشرقین نے ذمیوں کے لباس کے متعلق بھی اعتراض کیا ہے۔ روایات میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے ذمیوں پر یہ شرط عائد کی تھی کہ وہ اپنے لباس، جوتوں یا گھوڑوں کی زین وغیرہ میں مسلمانوں کی مشابہت اختیار نہ کریں اور اپنے سینوں یا کندھوں پر ایسی علامات رکھیں جو انہیں مسلمانوں سے ممتاز کرتی ہوں ۔یہ سب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے۔

کچھ مستشرقین نے خلیفہء عادل عمر بن الخطابؓ کی طرف ان شرائط کی نسبت کو مشکوک قرار دیا ہے کیونکہ ان کا کوئی ذکر ہمیں مورخین قدماء کی قابل اعتماد کتابوں میں جو کہ اس طرح کی باتوں کا اہتمام کیا کرتی ہیں نہیں ملتا(مثلاً ملاحظہ کیجیے طبری، بلاذری، ابن اثیر اور یعقوبی)۔(۲۰)

بہرحال (یہ اتنی معمولی بات ہے کہ) اگر فقط اس شرط کے اسباب و محرکات اور تاریخی سیاق ہی کو جان لیا جائے تو اس سے انکار یا اسکا رد کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ یہ ایک دینی معاملہ نہیں جس پر عمل ہر وقت ہر جگہ ایک عبادت سمجھا جائے جیسا کہ اسے ایک روایتی قانون قرار دینے والے بعض فقہاء کا خیال ہے بلکہ اس کی حیثیت حکومت کی جانب سے اس وقت کے معاشرے کی مصلحت کے مطابق جاری کی جانے والی ایک ہدایت سے زیادہ نہیں۔ اور ممکن ہے کسی اور وقت یا صورتِ حال میں یہ مصلحت تبدیل ہو جائے اور یہ ضابطہ ختم یا تبدیل کر دیا جائے ۔

اس زمانے میں مذہب کی بنیاد پر لوگوں کے مابین یہ فرق بہت ضروری تھا اور خود ان مذاہب کے پیروکاروں کی خواہش بھی یہی تھی۔ لباس کے علاوہ لوگوں میں تمیز کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ چونکہ شناختی کارڈ جس میں فرد کا نام، لقب اور دین و مذہب لکھا جاتا ہے ان لوگوں کے ہاں موجود نہیں تھا لہذا لوگوں میں تمیز کرنے کی ضرورت کے باعث ہی مسلم حکام اس طرح کی ہدایات جاری کرنے پر مجبور ہوئے۔ اسی لئے ہمیں اپنے زمانے میں کوئی ایسا مسلمان فقیہ نظر نہیں آتا جو لباس کی تفریق کو متقدمین کی طرح واجب سمجھتا ہو، کیونکہ آجکل اس کی ضرورت نہیں۔

اس قاعدے کے محرکات کے بارے میں ڈاکٹر خربوطلی کی پیش کردہ توجیہ یہاں نقل کرنا مفید ہوگا۔ (۲۱) ”ہماری رائے یہ ہے کہ اگر ہم مباحثے کی خاطر یہ فرض کر بھی لیں کہ دونوں خلفاء کی جانب سے اس نوعیت کی کوئی ہدایات جاری کی بھی گئیں تو اس میں کوئی اشکال نہیں کہ لباس کا یہ تعین معاشرتی زندگی کے سیاق میں کیا گیا جس کا واحد مقصد مختلف مذاہب کے پیروکاروں میں تمیز کرنا تھا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم تاریخ کے ایک ابتدائی دور کی بات کر رہے ہیں جب شناختی کارڈ موجود نہیں تھے لہذا لباس ہی ایک ایسی چیز تھی جس کے ذریعے لوگوں کا دین ظاہر ہوتا تھا۔ مسلمان عربوں کا اسی طرح مخصوص لباس تھا جس طرح کہ نصاریٰ و یہود اور مجوسیوں کے ہاں تھا۔ اگر مستشرقین لباس کے رنگ یا شکل کے تعین کو تشدد کا مظہر سمجھتے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس صورت میں تشدد کے شکار مسلمان اور ذمی مساوی طور پر ہوئے کیونکہ جب خلفاء نے مسلمانوں کو دوسروں کی مشابہت اختیار کرنے سے روکا تو منطقی طور پر غیر عرب اور غیر مسلم افراد کو عربوں اور

مسلمانوں کی مشابہت سے روکا گیا''۔

ٹریٹن نے بھی یہ مسئلہ زیرِ بحث لاتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔''لباس کے متعلق قواعد وضوابط سے غرض فقط عیسائیوں اور عربوں کے درمیان تمیز تھی۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کیونکہ اسکا ذکر ہمیں ابو یوسفؒ اور ابن عبدالحکمؒ دونوں کے ہاں نہایت تاکید کے ساتھ ملتا ہے اور یہ دونوں علمائے متقدمین میں سے ہیں۔ چونکہ اسلامی فتح کے وقت فریقین کے مخصوص اور الگ لباس ہوا کرتے تھے اس لیے نصاریٰ کو یہ ہدایت کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ وہ مسلمانوں سے مختلف لباس اختیار کریں۔عیسائیوں کے ہاں پہلے سے یہی دستور تھا جبکہ یہ پابندیاں لازمی قرار دینے کی ضرورت بعد میں اس وقت پیش آئی جب عربوں کے تمدن نے اس حد تک ترقی کرلی کہ ان کے مفتوحین لباس میں ان کی مشابہت اختیار کرنے لگے۔''(۴۲)

بہر حال اس معاملے میں جو رائے بھی اختیار کی جائے اور لباس کے متعلق ان احکام کی حقیقت جو بھی رہی ہو انہیں عملی طور پر بہت کم نافذ کیا گیا۔ ایک قانون کے ہونے اور اس کے نفاذ میں فرق ضروری ہے۔ چنانچہ اکثر خلفاء اور مسلم حکام نے رواداری ، اخوت اور مساوات پر مبنی حکمت عملی اختیار کیے رکھی اور انہوں نے اہل ذمہ کے لباس کے معاملے میں زیادہ مداخلت نہیں کی اور نہ ہی کوئی شکایت یا احتجاج اس بارے میں سامنے آیا۔

مذکورہ بالا تمام حقائق تاریخی دلائل کی مدد سے ثابت کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ نصرانی شاعر الاخطل (م ۹۵ھ) اموی خلیفہ عبدالملک ابن مروان کے پاس ریشمی جبے میں ملبوس

اور گردن میں سونے کی صلیب لٹکائے آیا کرتا اور اسکی داڑھی سے شراب ٹپک رہی ہوتی۔ لیکن پھر بھی خلیفہ اس کا پورے احترام کے ساتھ استقبال کرتا۔(۲۳) شام کے پہاڑی علاقوں میں آباد عیسائیوں جراجمة کے ساتھ ۹۸ھ میں جو معاہدہ مسلمانوں نے طے کیا اس میں یہ دفعہ شامل تھی کہ وہ مسلمانوں کا سا لباس پہن سکیں گے۔(۲۴)

امام ابو یوسف اہل ذمہ کے لباس کے متعلق لکھتے ہیں ''ان میں سے کسی کو لباس، سواری یا حلیے میں مسلمانوں کی مشابہت اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔'' مگر اس کی توجیہ میں انہوں نے حضرت عمرؓ کے اس قول سے استدلال کیا ہے کہ ''(یہ شرط اس لیے عائد کی جارہی ہے) تاکہ ان کا لباس مسلمانوں کے لباس سے ممتاز ہو''

المختصر: اس قانون میں تشدد کا کوئی پہلو نہیں بلکہ یہ فقط تمیز کی خاطر اختیار کیا جانے والا ایک معاشرتی وسیلہ ہے جیسا کہ ہم تمام معاصر معاشروں میں دیکھتے ہیں کہ ہر گروہ اور کسی خاص پیشے یا شہر سے تعلق رکھنے والے افراد کا ایک مخصوص لباس ہوا کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

عیسائیوں کے خلاف شورش کے واقعات

ہم نے دیکھا کہ خود انصاف پسند مغربی مورخین کے اعتراف کے مطابق غیر مسلموں نے مسلم معاشروں میں غایت درجہ امن و امان، آزادی اور عزت کی زندگی بسر کی۔ لیکن خود کو علماء و محققین ظاہر کرنے والے بعض لوگ اس تاریخ سے زبردستی وہ کچھ کہلوانا چاہتے ہیں جو کہنے پر یہ تیار نہیں اور اسے ان باتوں کا ذمہ دار ٹھہرانا چاہتے ہیں جن کی یہ ذمہ دار نہیں۔ چنانچہ یہ قبیح مقصد پورا کرنے کے لیے وہ پوری کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی رواداری کی بے مثال تاریخ کا چہرہ بگاڑ دیا جائے۔ اس کی خاطر یہ لوگ کچھ علاقوں اور مخصوص حالات و اسباب کے تحت چند عام اور بدخصلت لوگوں کی حرکتوں کو بنیاد بناتے ہیں حالانکہ اس طرح کے واقعات تو دنیا کے تمام ممالک میں آج تک پیش آتے رہے ہیں۔

ان واقعات کے اسباب

۱۔ اسلامی رواداری کے باعث بہت سے ذمیوں کو مالی اور انتظامی قوت جمع کرنے کا موقع مل گیا، مگر انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک روا نہ رکھا بلکہ انہیں دبانے، تکلیف پہنچانے، یہاں تک کہ ظلم و جبر کی کوششوں سے بھی باز نہ آئے۔ متز کا کہنا ہے ''نصاریٰ کا مقابلہ کرنے کے لیے برپا کی گئی تحریکوں کا اولین ہدف ذمیوں کے مسلمانوں پر تسلط سے جنگ تھی''۔(۲۵) اور ''مصر کے اکثر مسلم۔مسیحی فسادات قبطیوں کے جبر کی وجہ سے پیش آئے''۔(۲۶)

۲۔ بہت سے غیر مسلموں نے اس انداز سے دولت جمع کی کہ مسلم اکثریت میں احساسِ

محرومی پروان چڑھنے لگا۔ مسلمانوں کے خیال میں یہ دولت ناجائز طریقے سے اکٹھی کی گئی تھی بلکہ خود ان سے بالواسطہ طور پر چھینی گئی تھی کیونکہ اس کا بیشتر حصہ خلفاء اور امراء کی جانب سے دیے گئے تحفوں پر مشتمل تھا۔ چنانچہ غیر مسلموں سے ناراضگی کے یہ جذبات دینی اختلافات سے زیادہ طبقاتی ناانصافی کے احساسات پر مبنی تھے۔ آیئے آرنلڈ کی کتاب الدعوة الی الاسلام میں شامل درج ذیل مثال کا جائزہ لیتے ہیں۔

''خلیفہ عبدالملک نے الرہا کے ایک عیسائی عالم اثناسیوس کو اپنے بھائی عبدالعزیز کا اتالیق مقرر کیا۔ جب عبدالعزیز والیء مصر مقرر ہوا تو اثناسیوس بھی اپنے شاگرد کے ساتھ مصر گیا اور اس نے وہاں بڑی دولت جمع کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس چار ہزار غلام، بہت سے گاؤں، مکانات اور باغات تھے۔'' آرنلڈ کے مطابق ''اس کے پاس بے اندازہ سونا چاندی تھا''۔

''جب سپاہیوں کو تنخواہیں ملتیں تو اس کے بیٹے ہر سپاہی سے ایک دینار (اشرفی) وصول کیا کرتے تھے۔ مصر میں سپاہ کی کل تعداد تیس ہزار تھی اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اثناسیوس نے مصر میں اپنے اکیس سالہ قیام کے دوران کتنا مال و دولت جمع کیا ہوگا۔''(۲۷)

سر آرنلڈ لکھتے ہیں ''عیسائیوں نے خاص طور پر طبابت کے پیشے سے بہت سی دولت جمع کر لی تھی اور اونچے گھرانوں میں ان کی بڑی عزت و توقیر تھی۔ ہارون الرشید کا طبیبِ خاص جبرائیل نسطوری فرقے کا عیسائی تھا۔ آٹھ لاکھ درہم کے علاوہ جو اسے ہر سال اپنی ذاتی جائیداد سے حاصل ہوتے، دو لاکھ اسی ہزار درہم سالانہ وہ خلیفہ کی خدمت کے صلے

میں پاتا تھا۔ دوسرا طبیب بھی عیسائی تھا اور بائیس ہزار درہم سالانہ تنخواہ پاتا تھا۔ دراصل ان کی یہی دولت و ثروت تھی جس سے عام لوگوں کے دلوں میں حسد اور لالچ کے جذبات پیدا ہوتے تھے اور متعصب لوگ اس جذبے سے فائدہ اٹھا کر ان پر ظلم کرنے کے مواقع حاصل کرتے تھے۔"(۲۸)

۳۔ کچھ عیسائی اپنے ہم مذہب رومیوں کی مسلمانوں پر فتح پر خوشی کے شادیانے بجا کر عوام کو اشتعال دلایا کرتے بلکہ بعض عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف تاتاریوں کی فتح پر خوشیاں منائیں اور تکبر کا اظہار کیا۔ یہاں تک انہوں نے مسلمانوں کو چڑانے کی خاطر ان کے دشمنوں سے مل کر کچھ مساجد کو شراب سے آلودہ کیا۔

ہاں ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ ایسے حکام بھی ضرور رہے ہیں جنہوں نے ذمیوں پر ظلم و تشدد کیا لیکن اس قسم کی مثالوں کی حیثیت غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کے اسلامی عام اصول کی شاذ خلاف ورزی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس طرح کے حکام غالباً یہودیوں اور عیسائیوں سے پہلے خود مسلمانوں پر ظلم ڈھاتے تھے کیونکہ ظالم کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ بلکہ بہت سے ظالم حکام ایسے تھے کہ ذمیوں کے ساتھ تو معاہدے کا خیال کرتے ہوئے نرمی برتتے لیکن اپنے ہم مذہب مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتے۔ یہاں تک کہ مالکی فقیہ اور مصر میں اپنے زمانے کے شیخ العلماء شیخ الدردیر اپنے ہم عصر امراء کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے اہل ذمہ کو عزت دے کر مسلمانوں سے زیادہ بلند مقام دے رکھا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں: " کاش یہ لوگ جتنی عزت اہل ذمہ کی کرتے ہیں مسلمانوں کو اس کا دسواں حصہ ہی نصیب ہو جاتی"۔(۲۹) کئی مرتبہ مسلمان یہ

کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ کاش" ہمارے حکمران ہم پر یہود و نصاریٰ کی طرح جزیہ عائد کر دیں اور پھر ہمیں اسی طرح آزاد چھوڑ دیں جس طرح ان لوگوں کو چھوڑ رکھا ہے ﴿اور ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دو چار ہوتے ہیں﴾ (۳۰)

تعبیرِ نصوص میں غلطی

کچھ لوگ قرآنی آیات اور احادیث نبوی پر مشتمل دینی نصوص کو سطحی اور عاجلانہ انداز میں سمجھنے کی کوشش کرتے اور ان سے یہود، نصاریٰ اور دوسرے غیر مسلموں کے خلاف اسلامی تعصب کا ثبوت فراہم کرنا چاہتے ہیں۔

غلط فہمی کا شکار بننے والی ان نصوص کی واضح ترین مثالیں وہ آیات ہیں جن میں کافروں کے ساتھ دوستی کی مذمت کی گئی ہے اور ایسی آیات قرآن کریم میں بے شمار ہیں۔ مثلاً سورۃ آل عمران میں یہ ارشاد ربانی: ﴿مومنین اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو ہرگز اپنا رفیق اور یار و مددگار ہرگز نہ بنائیں، جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لیے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ مگر اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے﴾ (۳۱)

اور سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿اے لوگو جو ایمان لائے ہو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو؟﴾ (۳۲)

اس سے پہلے یہ فرمانِ باری:﴿جو منافق اہلِ ایمان کو چھوڑ کر اپنا رفیق بناتے ہیں انہیں یہ مژدہ سنادو کہ ان کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔﴾(۳۳)

اور سورۃ المائدہ میں ارشاد ہوتا ہے۔﴿اے لوگو جو ایمان لائے ہو ، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، یہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی انہی میں سے ہے، یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کردیتا ہے۔تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے انہی میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں'' ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہم کسی مصیبت کے چکر میں نہ پھنس جائیں''﴾(۳۴)

اور سورۃ التوبہ میں﴿اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں ۔تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے﴾(۳۵)

اور اسی طرح سورۃ مجادلہ میں﴿تم کبھی نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے ، یا ان کے بھائی یا ان کے اھلِ خاندان۔﴾(۳۶)

سورۃ الممتحنہ میں﴿اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے

لیے اور میری رضا جوئی کی خاطر (وطن چھوڑ کر گھروں سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں اور ان کی روش یہ ہے کہ رسول کو اور خود تم کو صرف اس قصور پر جلا وطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان لائے ہو۔ تم چھپا کر ان کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو علانیہ کرتے ہو، ہر چیز کو میں خوب جانتا ہوں﴾ (۳۷)

اسی سورۃ میں آیا ہے کہ ﴿اللہ تمھیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج پر ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں﴾ (۳۸)

مذکورہ بالا اور ان سے ملتی جلتی دوسری آیات سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ غیر مسلموں سے بدسلوکی، ان کے مقاطعے اور ان کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے کا حکم دیتی ہیں اگرچہ وہ دارالاسلام کے باشندے ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مسلمان ہم وطنوں کے ساتھ کتنے ہی مخلص کیوں نہ ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی مذکورہ آیات کا بنظرِ غائر جائزہ لیتا اور ان کے نزول کی تاریخ اور اس کے اسباب کا مطالعہ کرتا ہے اُسکے سامنے درج ذیل باتیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں:

۱۔ غیر مسلموں سے فقط ایک منفرد دین کی حامل جماعت کے طور پر دوستی کرنے سے روکا گیا ہے یعنی یہودی، عیسائی، مجوسی وغیرہ کی حیثیت سے نہ کہ پڑوسیوں یا شہریوں کی حیثیت سے۔ چونکہ ایک مسلمان کا دلی تعلق صرف امت مسلمہ کے ساتھ ہونا چاہئے اسی لئے

ان لوگوں کو دوست بنانے کی ممانعت کئی آیات میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ (مِن دون المؤمنین) یعنی کوئی شخص اپنی جماعت کے مقابلے میں ان سے محبت رکھے اور ان کا قرب حاصل کرے ۔ بے شک کوئی نظامِ زندگی ،دینی ہو یا وضعی، اپنے کسی پیروکار کو اجازت نہیں دے سکتا کہ اپنے گروہ کو چھوڑ کر کسی اور گروہ سے تعلقات استوار کرے، بالفاظ دیگر اس کام کا ارتکاب کرے جسے وطنیت کی اصطلاح میں غداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۲۔ جس دوستی سے ان آیات میں منع کیا گیا ہے وہ ہر اس شخص کی دوستی نہیں جو کسی دوسرے مذہب کا پیرو ہو اگر چہ وہ مسلمانوں کے ساتھ صلح پر اور ان کے ذمے میں ہی ہو بلکہ صرف ایسے شخص کی دوستی جو مسلمانوں کو ایذا پہنچائے اور اللہ اور اس کے رسولؐ سے دشمنی رکھے۔ اس بات پر درج ذیل قرآنی آیات دلالت کرتی ہیں۔

(ا) سورۃ المجادلہ میں ارشاد ربانی

﴿تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی ہے﴾ (۳۹) اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت صرف ان کا انکار نہیں بلکہ ان کی دعوت (کے پیغام) سے جنگ، اس کے راستے میں رکاوٹ بننا اور اس کے پیروکاروں کو ایذا دینا ہے۔

(ب) سورۃ الممتحنہ کے شروع میں خدا کا ارشاد

﴿''تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے رہو حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں اور ان کی روش یہ ہے کہ رسول

ﷺ کو اور خود تم کو صرف اس قصور پر جلا وطن کرتے ہیں تم اپنے رب اللہ پر ایمان لائے ہو۔﴾(۴۰)

یہ آیت مشرکین سے تعلقات قائم کرنے اور انکو دوستانہ پیغام بھیجنے کی تحریم کی وجہ بیک وقت دو چیزیں بتاتی ہے: اسلام کے ساتھ ان کا کفر اور رسولؐ اور مومنوں کو ان کے گھروں سے ناحق باہر نکال دینا۔

(ج) اسی سورۃ میں ارشاد باری تعالیٰ

﴿''اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں۔''﴾(۴۱)

دینی اختلاف رکھنے والوں کو دو فریقوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

ایک گروہ جس نے مسلمانوں کے ساتھ صلح کر رکھی ہے۔ اس نے نہ تو دینی معاملے میں ان سے جنگ کی اور نہ ہی ان کو جلا وطن کیا۔ یہ لوگ نیکی اور انصاف کے حقدار ہیں۔

دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جنہوں نے مسلمانوں کی طرف جنگ، جلاوطنی یا

اس پر معاونت کے ذریعے عداوت پر مبنی موقف اپنایا۔ ایسے لوگوں سے دوستی حرام ہے مثلاً مشرکین مکہ کہ جن کے ہاتھوں مسلمانوں کو سخت تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ اس آیت کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر فریق سے دوستی حرام نہیں۔

۳۔ یہ کہ اسلام نے مسلمانوں کے لئے اہل کتاب سے شادی کرنا مباح قرار دیا ہے اور ازدواجی زندگی کی بنیاد ذہنی سکون اور مودت و رحمت پر رکھی ہے جیسا کہ اس ارشاد باری میں ہے ﴿اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔﴾ (۴۲)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے ایک مسلمان کی غیر مسلم سے محبت میں کوئی حرج نہیں۔ بھلا ایک شخص اپنی اہل کتاب بیوی سے محبت کرنے سے اور ایک بیٹا جس کی ماں ذمیوں میں سے ہو اپنے ننھیال سے تعلقات رکھنے سے باز کیسے رہ سکتا ہے۔

۴۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام دینی تعلق کو دوسرے تمام تعلقات پر فوقیت دیتا ہے خواہ وہ نسلی، علاقائی، عصبیتی یا طبقاتی رشتے کے ہوں۔ چنانچہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہونے کی وجہ سے ایک امت تشکیل دیتے ہیں۔ یہ بات صرف اسلام کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر دین کی طبیعت میں شامل ہے اور انجیل کا قاری اس بات کی تائید ایک سے زیادہ مقامات پر پائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ ملاحظہ کیجیے ہماری تالیف، فقہ الزکاۃ، جلد ا، ص ۹۸ سے ۱۰۴۔

۲۔ الدعوۃ الی الاسلام، ص ۷۹۔

۳۔ طبری، التاریخ، ج ۲، ص ۳۲۱۔

۴۔ اس کا حوالہ باب دوم کے مبحث ''جزیہ کب ساقط ہوتا ہے؟'' میں دیا جا چکا ہے۔

۵۔ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۸۱۔

۶۔ بلاذری، فتوح البلدان، ص ۱۸۷۔

۷۔ طبری، ج ا، ص ۲۶۶۵۔

۸۔ دیکھئے ایل۔ الیف۔ مارسیگلی، Stato Militare dell'Imperio Ottomano، ایمسٹرڈم: بلیوتھیک فرینگائز، ۱۷۳۲ء) ج ا، ص ۸۶ وہ ان لوگوں کو ''مسلیم'' (Muselim) کا نام دیتے ہیں۔

۹۔ جی۔ فن لے، A History of Greece from its Conquest by the Romans to the Present Times، (آکسفرڈ: کلیرینڈن پریس، ۱۸۷۷ء) ج ۶، ص ۳۰، ۳۳۔

۱۰۔ وکٹر لازار، Die Sudrumanen der Turkei und der angrenzenden Lander، (بخارسٹ: جی آیونیسکوے، ۱۹۱۰ء)، ص ۵۶۔

۱۱۔ لا ژونکوے، Histoire de l'Emire Ottoman، (پیرس: لیبرارے ہیکت، ۱۸۸۱ء) ص ۱۴۔

۱۲۔ یہ ستونوں پر قائم ایک طرح کے پل ہوا کرتے تھے جن کے ذریعے شہروں تک پینے کے پانی کی ترسیل کی جاتی اور سلطنتِ روما میں پہلی صدی عیسوی سے مروج تھے۔

۱۳۔ تھامس اسمتھ، Remarks upon the Manners, Religion and Government of the Turks، (لندن: سینٹ پال چرچ یارڈ، ۱۶۷۸ء) ص ۳۲۴۔

۱۴۔ اثناسیوس دوروستامس، Neueste Beschreibungderer Griechischen Christen in der Turckey, aufgesetzt von Jacob Elssner، (برلن: کرستیان لدوگ، ۱۷۳۷) ص ۳۲۶۔

۱۵۔ لا ژونکوے، ص ۲۶۵۔

۱۶۔ الخربوطلی، الاسلام و اھل الذمۃ، ص ۷۱۔

۱۷۔ کتاب الخراج، ص ۷۲۔

۱۸۔ اے۔ ایس۔ ٹریٹن، The Caliphs، ص ۱۲۴۔

۱۹۔ ص ۷۲۔

۲۰۔ دیکھئے الاسلام و اھل الذمۃ، ص ۸۴ سے ۸۵۔

۲۱۔ الاسلام و اھل الذمۃ، ص ۸۶ سے ۸۷۔

۲۲۔ ٹریٹن، کتابِ مذکور، ص ۱۱۵۔

۲۳۔ ابو الفرج الاصفہانی، کتاب الأغانی، ج ۷، ص ۱۶۹ (مجھے اس روایت کی صحت پر تأمل ہے، یوں بھی الأغانی کی روایات قابلِ اعتبار نہیں، اور اگر یہ روایت صحیح ہو بھی تو یہ خلیفہ کی رواداری سے زیادہ اسکی لاپروائی پر دلالت کرتی ہے۔

۲۴۔ بلاذری، فتوح البلدان، ص۱۸۹۔

۲۵۔ الحضارۃ الاسلامیہ فی القرن الرابع الهجری، ج۱ص۶۸۔

۲۶۔ حوالہ سابق، ص۷۲۔

۲۷۔ الدعوۃ الی الاسلام، ص۸۱سے۸۲۔

۲۸۔ حوالہ سابق، ص۸۲سے۸۳۔

۲۹۔ علامہ ابو البرکات احمد بن محمد الدردیر، الشرح الصغیر مع حاشیة علامة صاوی ،(قاہرہ: دار المعارف،۱۳۹۲ھ) ج ۲،ص، ۳۱۵۔

۳۰۔ سورۃ الشعراء : ۲۲۷۔

۳۱۔ سورۃ آل عمران : ۲۸۔

۳۲۔ سورۃ النساء : ۱۴۴۔

۳۳۔ النساء: ۱۳۸سے ۱۳۹

۳۴۔ المائدہ: ۵۱سے۵۲۔

۳۵۔ سورۃ التوبہ:۲۳۔

۳۶۔ سورۃ المجادلہ: ۲۲۔

۳۷۔ سورۃ الممتحنہ:۱۔

۳۸۔ سورۃ الممتحنہ:۹۔

۳۹۔ سورۃ المجادلہ: ۲۲۔

۴۰۔ سورۃ الممتحنہ: ۱۔

۴۱۔ سورۃ الممتحنہ: ۸ سے ۹۔

۴۲۔ سورۃ الروم: ۲۱۔

بابِ ششم

تقابلی جائزہ

کسی شے کا حسن اس کے متضاد کے مشاہدہ کرنے سے ہی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اسلامی رواداری کی عظمت اور مسلمانوں کی فراخدلی کا عملی مشاہدہ کرنا چاہے تو اسے دیگر ادیان کے دوسروں کے ساتھ روا رکھے گئے سلوک کی تاریخ دیکھنی اور جدید لادینی عقائد رکھنے والوں اور بیسویں صدی کے مختلف انقلابی نظریات کے داعیوں کا اپنے مخالفین کے ساتھ کیا گیا سلوک ملاحظہ کرنا چاہیے۔ اسے دیکھنا چاہئے کہ ان لوگوں نے مختلف عقیدے اور فکری رجحانات کے حامل افراد کے ساتھ ماضی میں کیا معاملہ کیا اور آج کل انکے ساتھ کیسا برتاؤ کر رہے ہیں۔ اسے چاہیے کہ وہ اس سلوک کا بھی جائزہ لے جو ان لوگوں نے جدوجہدِ انقلاب کے ان ساتھیوں سے اس وقت کیا، جب انہوں نے ان کی رائے سے اختلاف کیا یا ان سے مختلف سوچ اختیار کی۔

بہتر ہوگا کہ محقق مسلمانوں کی فتحِ اندلس کی تاریخ کا بغور مطالعہ کرے اور دیکھے کہ آٹھ سو سال کے عرصہ کے بعد (جسکے دوران مسلمانوں نے پورے اندلس کو علم کی روشنی سے منور کر دیا اور وہاں قابلِ فخر تہذیب کی بنیاد رکھی) ہسپانوی عیسائیوں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اسے دیکھنا چاہئے کہ متعصب عیسائی، ملحد، بالشویکی اور تنگ نظر ہندو حکومتوں کے زیر اقتدار ملکوں میں نئی روشنی، تہذیب، اقوام متحدہ جیسی بین الاقوامی تنظیموں اور انسانی حقوق کے غلغلے کے موجودہ دور میں مسلمان کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اسے حبشہ میں غالب اکثریت ہونے کے باوجود مسلمانوں پر توڑے جانے والے مظالم، تشدد اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا جائزہ بھی لینا چاہئے(۱) اسی طرح اسے چاہئے کہ روس، یوگوسلاویہ، چیچنیا جیسے مارکسی اشتراکی ملکوں کے مسلمانوں کی حالتِ زار کا جائزہ لے۔(۲) بعض روسی جمہوریتوں اور بعض چینی علاقوں میں آبادی کا غالب اکثریتی حصہ ہونے کے باوجود مسلمانوں کو ہر وہ کام کرنے سے روکا جاتا ہے جسے وہ واجب سمجھتے ہیں مثلاً نمازِ پنجگانہ، بیت الحرام کا حج، دینی علم کا حصول، اسلامی شعائر کے اظہار کے لئے مساجد کی تعمیر یا ان کو ائمہ، معلمین اور خطباء کی فراہمی کیلئے مدرسوں کی تعمیر یا اپنے رب کی عطا کردہ اس شریعت کا نفاذ جسے وہ لوگ واجب خیال کرتے ہیں۔

جب تک ایک انصاف پسند شخص اس باب میں معاصر سیکولر نظریات کے ماننے والوں کی کارکردگی پر ایک نظر نہ ڈال لے اسے غیر مسلموں کے ساتھ برتی گئی اسلامی رواداری کی قدر و قیمت کا احساس نہیں ہوسکتا!

حقیقت یہ ہے کہ انقلابات کے دوران جبر و تشدد، قتلِ عام اور دہشت گردی کے واقعات شاذ و نادر یا کسی وقتی ضرورت کے تحت نہیں ہوتے بلکہ مخالفین کے ساتھ یہ سب کچھ ایک مستقل پالیسی کی حیثیت رکھتا ہے جو تشدد کو جواز فراہم کرنے والے بلکہ اسے انقلاب کے فرائض و لوازم کا حصہ قرار دینے والے فلسفیانہ نظریات پر مبنی ہوا کرتی ہے۔(۳)

بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ یہ تشدد پسندی ماضی و حال کی تمام انقلابی دعوتوں کا خاصہ رہی ہے۔ مگر ایسا دعویٰ کرتے ہوئے یہ لوگ اسلام کا منفرد موقف بھول جاتے ہیں۔ یہ بھی

یاد رکھنا چاہیے کہ تشدد برائے انقلاب کی پالیسی تب ہی کامیاب ہو سکتی ہے جب اسے ایک تسلسل کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

جدید لادینی آئیڈیالوجی کے ایک ماہر کا کہنا ہے:

''حکومت پر قبضے سے قبل تشدد ایک غیر منظم صورت میں سامنے آتا ہے جس کا ہدف انارکسٹوں، جن میں سرفہرست روسی انارکسٹ ہیں ، کے مطابق ڈرادھمکا کر حکومت کو کمزور کرنا اور پھر اس پر قابض ہو جانا ہے۔لیکن حکومت پر قبضے کے بعد یہ تشدد ایک ایسی منظم صورت اختیار کر لیتا ہے جس کا مقصد ریاست کو کمزور کرنے کی بجائے اس کو مضبوط کرنا ہوتا ہے۔ اگر پہلی نوع کا تشدد بڑے بڑے اور حساس نوعیت کے مراکز پر براجمان افراد کو نشانہ بناتا ہے تو اجتماعی تشدد کا ہدف عوام بحیثیت مجموعی یا کوئی خاص گروہ بنتا ہے۔ اور اس موخر الذکر نوع کا مقصد صرف دہشت گردی ہی نہیں بلکہ مخالفین کو جڑ سے ختم کر دینا ہے تا کہ معاشرے میں نیا مسلک پنپ سکے''۔(۴)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اشتراکیوں نے انقلابِ روس کے دوران اور اس کے بعد قتل و غارت کا ایسا بازار گرم کیا جس کی ہولناکی ناقابلِ تصور ہے ، یہاں تک کہ موجودہ دور کی پہلی اشتراکی ریاست کے بانی لینن کے پاس جب اس کے کچھ ساتھی قتل و غارت گری کے واقعات پر غضبناک ہو کر پہنچے تو اس نے انہیں نہایت مختصر اور سیدھا سادا جواب دیا:
''تین چوتھائی عوام کے غارت ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہماری نظر میں اہم بات یہ ہے کہ باقی بچنے والے لوگ اشتراکیت اختیار کر لیں''۔(۵)

اور جو ظلم و ستم سٹالن کے دور میں ہوئے اور جس طرح عوام کو خون میں نہلایا گیا اس کے بارے میں مبالغہ آرائی ممکن نہیں نہ ہی اس کی مثالیں ذکر کرنے کی یہاں ضرورت ہے کیونکہ خروشیف کے زمانے میں دنیا بھر کے اخبارات روزانہ اس کی خبریں شائع کرتے رہے ہیں۔(٦)

جدید انقلابی تشدد کے داعی اپنے مخالفین کے خلاف پر تشدد کارروائیوں کا جواز فراہم کرنے کے لئے دراصل اس بدسلوکی، تشدد اور قتل عام کو بنیاد بناتے ہیں جس کی مثالوں سے مذاہب کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ ان کا زور عیسائیت کی ابتدائی اور ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ پر ہوتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ منظم تشدد جس کا سہارا اشتراکیوں اور نازیوں نے لیا وہ تو ٹروٹسکی اور ہٹلر وغیرہ نے کچھ مسیحی مکاتب فکر سے سیکھا ہے جن میں سرفہرست یسوعی فرقہ (Jesuits)، مذہبی تفتیشی ادارے اور" الف سعادتی تحریکات (Millenial Movements) ہیں۔

محبت اور سلامتی کی پرچارک عیسائیت نے جو خود اپنی تاریخ کے ابتدائی دنوں میں طرح طرح کے مظالم سہہ چکی تھی ریاستی قوت کی مالک بننے پر اپنے مخالفین پر وہ ستم ڈھائے کہ ان کے ذکر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شیخ محمد عبدہ نے اپنی کتاب الاسلام والنصرانیہ میں ذکر کیا ہے کہ ہسپانوی کلیسا جب افکارِ ابن رشد کی، خاص طور پر یہودیوں کے ہاں مقبولیت پر ناراض ہوا تو اس کا نزلہ مسلمانوں اور یہودیوں دونوں پر گرا۔ لہذا اس نے عیسائی بننے سے انکاری تمام یہودیوں کو ملک سے نکل جانے کا حکم دیا اور انہیں اپنی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کی فروخت کی اجازت اس شرط پر دی کہ وہ اپنے ساتھ سونا چاندی لے کر نہ جائیں۔ چنانچہ ہسپانیہ سے یہودی اپنی املاک پیچھے چھوڑ کر اور اپنی جانیں بچا

کر بھاگے اور ان میں سے کئی بھوک، سفر کی مشقت اور مفلسی کے باعث ہلاک ہو گئے۔

اسی طرح کلیسا نے ۱۰۵۲ء میں مسلمانوں کو (جو کہ ان کے نزدیک دشمنان خدا قرار پائے تھے) حکم دیا کہ اگر وہ عیسائیت قبول نہیں کرتے تو ملک چھوڑ دیں اور واپس بھی کسی ایسے رستے سے جائیں جو مسلم ممالک میں سے نہ گزرتا ہو ورنہ موت کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہیں۔(۷) تشدد اور اذیت رسانی صرف بت پرستوں اور دینی مخالفین تک ہی محدود نہ تھی بلکہ وہ عیسائی بھی اس کا شکار ہوئے جنہوں نے امراء یا کلیسا کے منظورِ نظر عقیدے سے اختلاف کی جرأت کی۔

عیسائیت کی تاریخ پر نظر رکھنے والے اس بات سے خوب واقف ہیں کہ الوہیت مسیح کا انکار کرنے والے مصری عالم آریوس (Arius) اور اسکے پیروکاروں کے ساتھ نیقیہ (Nicea) کی کونسل (۳۲۵ء) میں کیا سلوک ہوا اور کس طرح اکثریت کے حامل مخالفین کو نکال باہر کرنے کے بعد آریوس کو مجرم قرار دیا گیا، اس کی کتابوں کو اپنے پاس رکھنے کی ممانعت اور انہیں جلانے کا فیصلہ صادر کیا گیا اور ساتھ ہی اس کے پیرؤوں کی تمام عہدوں سے معزولی، جلا وطنی اور ہر اس شخص کے لئے پھانسی کا حکم سنا دیا گیا جو آریوس کی کوئی کتاب چھپا کر رکھے یا اس کے مسلک کی حمایت کرے۔

توحید کی دعوت دینے والوں پر اسقدر پیہم ظلم ڈھائے گئے کہ وہ عیسائی معاشروں سے بالکل نابود ہو گئے اور ان کی دعوت کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ ایک محقق کا کہنا ہے کہ کچھ اقوال اور تورات کے بعض اصولوں کی توجیہ کے متعلق عیسائیوں کے درمیان رونما ہونے والے

الٰہیاتی اختلافات تباہ کن قتل و غارت کا باعث بن جاتے تھے۔ مثلاً یہ سوال کہ آیا روح القدس باپ اور بیٹے دونوں سے مشتق ہے یا صرف بیٹے سے؟ کیا روٹی اور شراب (عیسیٰ علیہ السلام کے) گوشت اور خون میں تحویل ہو جاتے ہیں یا نہیں؟ مسیح دو فطرتوں۔یعنی خدائی اور انسانی۔کا مالک ہے یا نہیں؟ ان جھگڑوں میں لاکھوں لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ایمان والوں نے ایک دوسرے پر طرح طرح کے ستم ڈھائے۔(۸)

اور جب یورپ میں مارٹن لوتھر کے ہاتھ پروٹسٹنٹ مذہب کا ظہور ہوا تو کیتھولک کلیسا نے اس مذہب کے پیروکاروں کا پوری قوت سے مقابلہ کیا اور تاریخ انسانی نے قتلِ عام کے خوفناک مناظر دیکھے۔ان میں سے سب سے دہشت ناک واقعہ ۲۴ اگست ۱۵۷۲ء کو پیرس میں پیش آیا جب کیتھولک فرقے کے لوگوں نے پروٹسٹنٹ حضرات کو دعوت دی کہ وہ مذہبی مفاہمت کو فروغ دینے کے لیے ان کے پاس کچھ دن قیام کریں۔اور پھر رات کے اندھیرے میں میزبان مہمانوں پر ٹوٹ پڑے اور سوتے میں انہیں دھوکے سے قتل کر دیا اور جب صبح ہوئی تو پیرس کی گلیاں ان لوگوں کے خون میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس کارنامے پر پوپ، کیتھولک عیسائیوں کے اکابر اور بادشاہوں کی جانب سے شاہ چارلس نہم کے لئے مبارکبادوں کا تانتا بندھ گیا۔

تعجب ہے کہ جب پروٹسٹنٹ فرقے کو بالادستی حاصل ہوئی تو یہی وحشیانہ سلوک اس نے کیتھولک فرقے کے لوگوں کے ساتھ کیا اور وحشت و بربریت کے مظاہروں میں ان سے پیچھے نہ رہے۔(۹)

مارٹن لوتھر نے تو اپنے پیروکاروں سے کہہ رکھا تھا'' تم میں جس کسی کے لئے ممکن ہو دشمنوں کو قتل کرے، گلا گھونٹے اور انہیں ذبح کرکے مارڈالے۔تم سے جتنا ہو سکے اتنا قتل کرو! ان کسانوں کے گلے گھونٹو اور ذبح کرو!۔(۱۰)

اس میں کوئی تعجب نہیں کہ یورپ میں برپا ہونے والی مذہبی جنگوں نے کئی سفا کیوں کو جنم دیا۔فیارک کے بقول تیس سالہ مذہبی جنگ نے جرمن قوم کی اکثریت کو یا تو صفحہء ہستی سے ہی مٹا دیا یا فقروفاقہ کا شکار بنا دیا اور اکثر ترقی یافتہ شہر جل کر راکھ ہو گئے۔ بیسویں صدی اپنے وحشیانہ نازی و اشتراکی انقلابات کے باوجود صلیبی جنگوں کی ان ہولنا کیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی جن کا ارتکاب صرف عیسائیوں نے آپس میں کیا۔ یہاں تک کہ کچھ جنگوں میں تو راستوں پر لاشوں کے فرش بچھ گئے

فیڈہم کے مطابق ان جنگوں کی تاریخ سفاکی کے واقعات سے مملو ہے کیونکہ اہل کلیسا ہر وقت جلتی پر تیل ڈالتے اور سپاہیوں کی بربریت کی آگ کو ہوا دیتے رہتے۔ سپاہی تو سنگدل ہونے کے باوجود کبھی کبھار نرمی کی طرف مائل ہو بھی جاتے البتہ اہل کلیسا ہر طرح کے اعتدال اور نرمی کو ایک طرح کی غداری تصور کرتے تھے۔(۱۱)

ایک اور مورخ نے ازمنۂ وسطی کی عیسائیت کا موقف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک انقلابی آئیڈیالوجی کی حیثیت سے عیسائیت کا اعلیٰ ترین مقصد یہ تھا کہ ایک ایسی جدید مسیحی دنیا وجود میں لائی جائے جس میں عیسائیوں کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ازمنۂ وسطی میں معاشرے کا فرد بننے کے لئے عیسائیت پر ایمان رکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ ایک بت پرست،

یہودی یا مسلمان کو عیسائی معاشرے کا حصہ نہ سمجھا جاتا۔

اپنی اشاعت کی خواہاں عیسائیت یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے ابتدائی دور میں تو تلوار کا استعمال کیا کرتی، اختیار فقط موت یا قبولِ مسیحیت کے مابین دیا جاتا، لیکن بعد میں مشنری سرگرمیاں بھی اسی مقصد کے حصول کے لئے استعمال ہونے لگی۔

اس کی ایک زندہ مثال صلیبی تحریک ہے جسے گیارھویں سے لے کر چودھویں صدی عیسوی تک اپنے مقصد کے حصول اور غیر مسیحی قوموں کو فنا کر کے تمام دنیا کو عیسائی بنا دینے کی کھلی آزادی تھی۔ یہ بات پہلی صلیبی جنگ کی روح کا اظہار کرنے والی ایک نظم (رولان Roland) کے آخری اشعار سے واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نظم کے مطابق کفار کو عیسائی بننے پر مجبور کیا جانا چاہئے اور جو اس سے انکار کرے اسے گلا گھونٹ کر، زندہ جلا کر یا ذبح کر کے ہلاک کر دینا چاہئے۔

مذہبی تشدد کا ہدف صرف مسلمان ہی نہیں بنے بلکہ یورپ میں ہر وہ شخص ان کا شکار ہوا جس نے کلیسا سے بغاوت یا اس کے موقف سے ذرہ بھر انحراف کی بھی جرأت کی۔ مثلاً البیجنس (Albigenses) والدنس(Waldenses) اور کیتھارٹکس (Cathartics) کے خلاف بارھویں اور تیرھویں صدی میں کی جانے والی کارروائیوں سے کیتھولک کلیسا کا مقصد ان فرقوں کو صفحہ ہستی سے نابود کر دینا تھا اور وہ ایسا کرنے میں کامیاب بھی رہی ۔ چنانچہ کلیسا نے مردوں، عورتوں اور بچوں کو اجتماعی طور پر زندہ جلایا یا دوسرے طریقوں سے ہلاک کردیا۔ ایک اور مصنف بری (Burry) نے اس ضمن میں ایک اہم بات کا ذکر کیا ہے۔ ان

کے مطابق کلیسا نے یہ اصول پہلی مرتبہ عام یورپی قوانین کا حصہ بنایا کہ بادشاہ صرف ایک چیز کی بنیاد پر قیادت کا حقدار ہے اور وہ ہے کلیسا کے باغی فرقوں کا خاتمہ۔ اگر اس سلسلے میں کوئی حاکم تردد کا مظاہرہ کرے تو کلیسا اس کی اصلاح کرے گا اور اسے اطاعت پر مجبور کرنے کے لیے اس سے مراعات اور اراضی چھین کر کسی بھی دوسرے شخص کی ملکیت میں دیدے گا۔ فاضل منصف کے خیال میں رومیوں کی جانب سے نصرانیوں پر کیے گئے مظالم کی وجہ بھی عیسائیوں کا تعصب، دوسرے تمام ادیان کی مخالفت، ایمان کی دوسری تمام اشکال سے دشمنی اور یہ عقیدہ کہ عیسائیت کی اپنی کامیابی دوسرے تمام عقائد کا خاتمہ ہے۔

اسی صورتِ حال نے ولیم جیمس کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ کھلے پیمانے پر مذہبی تشدد کی مثال تاریخ انسانیت نے توحیدی ادیان کے ظہور سے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ درحقیقت عیسائیت دنیا میں وہ پہلا مذہب تھا جس کا خاصہ ہی مذہبی تعصب تھا اور جس نے اپنے مخالفین کو فنا کر دینے کی ٹھان رکھی تھی۔

کلیسا کی مذہبی فرقہ بازی کی تحریکوں کے ساتھ جنگ کا مقصد ہمیشہ سے مخالفین کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا رہا ہے اور ان فرقوں میں سے کچھ کی یہی کوشش رہی ہے کہ وہ کلیسا کے تمام پیروکاروں کو نابود کر دیں۔

مسیحیت نے، جس کی نمائندگی کلیسا کرتا ہے، بیک وقت بیرونی ''کفار'' اور داخلی مرتدین کے خلاف جنگ لڑی چنانچہ اس نے اول الذکر کے خلاف قتل کی صلیبی جنگیں لڑیں جبکہ موخر الذکر گروہ کے خلاف تفتیشی عدالتیں قائم کیں۔ ''تمام منحرف فرقوں کی سزا زندہ جلا دینا قرار پائی ہاں اگر کوئی شخص نادم ہو کر اپنی غلطی سے توبہ کر لیتا تو اسے عمر قید کی

سزا دی جاتی۔ ایک مرتد کی تمام املاک اسکی دوسری نسل تک ضبط کر لی جاتیں، اس کے رشتہ داروں کو اس وقت تک کسی منصب کا اہل نہیں سمجھا جاتا جب تک اپنے مرتد رشتہ دار یا کسی اور کافر کو پکڑوانے میں مدد نہ کریں۔ کفار کی کسی بھی طرح مدد کرنے والے کے لئے یہی سزا تھی۔ یہاں تک کہ مردے بھی محفوظ نہ تھے کیونکہ عدالتیں اس شخص کی قبر کشائی اور لاش کو جلانے کا حکم جاری کر دیا کرتی تھیں۔ دوسروں کو گرفتار کروانے کی حوصلہ افزائی اس درجے تک کی جاتی تھی کہ جدید انقلابات کے دوران اسکی مثال نہیں ملتی۔

ہنری چارلس لی نے ازمنۂ وسطیٰ کی تفتیشی عدالتوں کے بارے میں اپنی کلاسیکی تحقیق (History of the Inquisition in the Middle Ages) میں لکھا ہے کہ تمام عدالتیں ان سب لوگوں کے خاتمے کی پابند تھیں جنہیں کلیسا کافر گردانتا۔ ورنہ وہ اپنی حیثیت سے محروم کر دی جاتیں۔ جو حاکم کلیسا کے فرمان کے مطابق اپنی زیرِ ملکیت زمین کو کافروں سے پاک کرنے میں ایک سال تک غفلت برتتا اس کی زمین چھین کر کسی ایسے شخص کے حوالے کر دی جاتی جو کفار کو فنا کرنے اور ان پر قابو پانے پر قادر ہو۔'' فرمانِ ایمان'' کی رو سے ،جس کی بنیاد پر تفتیشی عدالتیں مرتدوں کو سزا سنایا کرتی تھیں ،تمام عوام ان عدالتوں کے خادم تھے اور دوسروں کی جاسوسی کرنا اور کسی کفریہ یا ارتدادی کاروائی کی اطلاع عدالت کو فراہم کرنا ان کا فرض تھا۔(۱۲)

شیخ محمد عبدہ کا ان تفتیشی عدالتوں کے متعلق کہنا ہے کہ ان کی سختی اسقدر بڑھ گئی کہ اس زمانے کے لوگوں میں مشہور تھا کہ ایک شخص کے لیے عیسائی ہو کر اپنے بستر پر مرنا تقریباً ناممکن ہے۔وہ مزید کہتے ہیں ۱۴۸۱ء میں اپنی تاسیس سے لے کر سن ۱۸۱۸ء تک مذہبی

عدالتوں نے ۳۴۰۰۰۰ افراد کا محاکمہ کیا جن میں سے ۱۲۰۰۰۰ افراد زندہ جلا دیئے گئے۔(۱۳) عیسائیت کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کیونکہ ابتدائی دور میں اس کی اشاعت عام طور پر ایسے ہی ہوئی کہ دوسروں کو موت اور عیسائیت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا۔

رابرٹ بریفالٹ نے ذکر کیا ہے کہ عیسائیت نے یورپ میں اپنی اشاعت کے دوران جن لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا ان کی تعداد کا اندازہ مورخین نے کم سے کم ۷ ملین اور زیادہ سے زیادہ ۱۵ ملین کا لگایا ہے۔(۱۴) اس امر کی شدت کا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ یورپ کی اس وقت کی آبادی موجودہ آبادی سے کہیں کم تھی۔عیسائیوں نے دوسروں کے خلاف جن مظالم اور سفاکیوں کا ارتکاب کیا اس کی سند انھیں تورات میں ملی تھی جو ان مخالفوں کے متعلق کہتی ہے: ''ان کی عبادت گاہوں کو منہدم کر دو۔ ان کے ستون آگ میں جھونک دو اور تمام بتوں کو آگ لگا دو''۔ تورات یہ ہدایت بھی کرتی ہے کہ شہروں کو فتح کرنے کے بعد آگ لگا دینی چاہیئے اور اس میں موجود ہر مرد، عورت اور بچے کو قتل کر دینا چاہیے۔

ان وحشیانہ مظالم کا ارتکاب کرنے والوں کا دعویٰ یہ تھا کہ ایسا کرنے سے انہیں خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے اور وہ اس کی خواہشات کو عملی جامہ پہناتے اور اس کے دشمنوں کو اس عذاب میں سے کچھ حصہ چکھاتے ہیں جو آخرت میں ان کے لئے منتظر ہے۔ سولھویں صدی میں ملکہ برطانیہ میری نے اس بات کا یوں اظہار کیا تھا: ''چونکہ کافروں کی ارواح کو جہنم میں ہمیشہ جلنا پڑے گا اس لئے ہمیں چاہیئے کہ انہیں اس دنیا میں بھی جلا کر خدائی انتقام کی تقلید کریں''۔(۱۵)

حوالہ جات

۱۔ ملاحظہ کیجیے کتاب مأساۃ الاسلام الجریح فی حبشۃ ، اس طرح حبشہ میں مسلمانوں کی صورتِ حال پر جامعہ ازھر کے دو طالبعلموں کی تیار کردہ رپورٹ بھی لائق مطالعہ ہے جسے شیخ محمد الغزالی نے اپنی کتاب کفاح دین میں "ذئاب الحبشۃ تنھش الاسلام" کے عنوان کے تحت شائع کیا ہے۔ مزید برآں دیکھئے کتاب اریتریا والحبشۃ از محمود شاکر، مکتبۃ الأقصیٰ، عمان۔

۲۔ دیکھئے شیخ محمد الغزالی کی کتاب الاسلام فی وجہ الزحف الأحمر (دمشق: مکتبۃ الأمل، ۱۹۶۶ء) کا باب "أحوال المسلمین فی الاتحاد السوفیتی"۔

۳۔ انقلابی اشتراکیوں کے فلسفے کے مطابق لوگو ں کا ذہن انقلابی بنانے اور انقلابی حرکیات (Dynamics) کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے تشدد ضروری ہے اور عوام کو بیدار کرنے، مستقل حرکت میں رکھنے اور انکے انقلابی جذبات کو ابھارنے کے لیے تشدد کا راستہ اپنانا ضروری ہے۔ تشدد کا مطلب انقلاب کو ایک تسلسل کے ساتھ عوام کی توجہ کا مرکز بنائے رکھنا ہے مبادا عوام اس سے غافل ہو جائیں یا ان کی یادداشت یا ضمیر سے یہ غائب ہو جائے۔ بالفاظ دیگر عوام کو انقلاب کو ایک رسمی چیز سمجھ لینے سے روکنے کا ذریعہ ہے (کیونکہ انقلاب کی اہمیت کا احساس ختم کرنا اسکا گلا گھونٹنے کے مترادف ہے،، ڈاکٹر ندیم البیطار، الایدیولوجیۃ الانقلابیۃ ،(بیروت: المؤسسۃ الأھلیۃ للطباعۃ والنشر) فصل "العنف الانقلابی،" ص ۷۰۱۔

۴۔ دیکھئے ، الایدیولوجیۃ الانقلابیۃ، ۷۰۶ سے ۷۰۷۔

۵۔ حوالہ مذکور، ص ۶۸۸۔

۶۔ دیکھئے کامریڈ خروشیف کا کمیونسٹ پارٹی کے بیسویں اجلاس سے خطاب (ترجمہ، ماہر نسیم، مقدمہ:

عباس العقاد، مكتبة الأنجلو المصرية، الرسالۃ پریس)

۷۔ محمد عبدہ، الاسلام والنصرانية مع العلم و المدنية، (قاہرۃ: مطبعة محمد علی صبیح، ۱۹۵۴ء)، ص ۳۶ سے ۳۷۔

۸۔ الايديولوجية الانقلابية، ص ۱۴۔

۹۔ ملاحظہ کیجئے ڈاکٹر احمد شلبی، المسيحية (القاهرة: مكتبة النهضة المصرية، ۱۹۶۰)، ص ۳۷ سے ۳۸۔

۱۰۔ الايديولوجية الانقلابية، ص ۱۰۔

۱۱۔ الايديولوجية الانقلابية، ص ۱۶۔

۱۲۔ الايديولوجية الانقلابية، ص ۵۸۶ سے ۵۸۸۔

۱۳۔ حوالہء مذکور، ص ۱۵۔

۱۴۔ الاسلام والنصرانية مع العلم و المدنية۔

۱۵۔ الايديولوجية الانقلابية، ص ۱۴۔

اختتامیہ

ہمیں امید ہے کہ اب یہ بات اسلامی شریعت اور تاریخ کی روشنی میں واضح ہو چکی ہے کہ جس طرح کتاب و سنت کی نصوص اور خلفاء راشدین کے زمانے سے لے کر اموی، عباسی، عثمانی اور ممالیک وغیرہ کی مختلف علاقوں میں عظیم تاریخ غیر مسلموں کے ساتھ اسلامی رواداری پر شاہد ہیں اسی طرح عالم اسلام کی موجودہ صورتحال بھی اس کا عملی ثبوت ہے کیونکہ اسلامی ممالک میں بے شمار کلیسا اور معبد موجود ہیں اور اذان اور ناقوس کی یکساں آوازیں سنائی دیتی ہیں جبکہ غیر مسلم اقلیتیں امن، استحکام اور دینی اور دنیاوی معاملات میں کامل آزادی سے زندگی بسر کر رہی ہیں ۔ دوسری جانب مسلم اقلیتیں (بلکہ بعض اوقات اکثریتیں بھی) بہت سی ایشیائی افریقی، یورپی ریاستوں میں تشدد اور جبر کا شکار ہیں۔ انہیں نہ تو دینی آزادی حاصل ہے اور نہ ہی دنیاوی ۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ دوسروں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے جو وہ ہمارے ساتھ کرتے ہیں کیونکہ ہمارا دین اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کو دوسرے ممالک میں ان کے ہم مذہبوں کی حرکات کی سزا دیں جبکہ وہ ان سے کوئی تعلق بھی نہیں رکھتے۔خداتعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا﴾ سورۃ الأنعام: ۱۶۴

لیکن حیرت ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ اسلام کے اسقدر واضح موقف کے باوجود بعض مغربی مصنفین اس کی شکل بگاڑنے حق، تاریخ اور حقیقت کے خلاف افترا پردازی کی

کوشش کرتے اور اسلام اور مسلمانوں پر ذمیوں کے ساتھ تعصب برتنے کا الزام لگاتے ہیں۔ یہاں تک کہ یونیسکو جیسی تنظیم جسے سب سے زیادہ بین الاقوامی اور غیر جانبدار ہونا چاہیئے اور جس کی سرگرمیوں اور اخراجات میں اسلامی اور عرب ممالک سخاوت کے ساتھ شریک ہوتے ہیں تاریخ انسانیت پر اپنی کتاب میں اسلام پر ایسے الزامات لگاتی ہے جن سے وہ بالکل اسی طرح بری الذمہ ہے جس طرح کہ بھیڑیا یوسف علیہ السلام کے خون سے۔ اور دوسری جانب کچھ لوگ رواداری کے تصور کا سہارا لے کر خود مذاہب کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔

ہم رواداری کے داعی ضرور ہیں کیونکہ ہمارا دین اس کا حکم اور اس کی دعوت اور تربیت دیتا ہے مگر رواداری کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم کسی شخص کی خوشی کی خاطر اپنے دین سے دستبردار ہو جائیں۔ اس بات کا رواداری سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ مخلوق کو خالق پر اور خواہش نفس کو حق پر ترجیح دیتے ہوئے اپنے دین سے اعراض اور کفر کرنے کے مترادف ہے۔ ہم کسی سے اس کا دین چھوڑنے کا مطالبہ نہیں کرتے کہ وہ ہم سے یہ مطالبہ کرے۔

رواداری کا یہ تقاضا ہرگز نہیں کہ مسلمان سے احکام شریعت کو منجمد کر دینے، خدا کی مقرر کردہ حدود کو معطل کر دینے، اپنے منہج حیات کو ختم کر دینے کا مطالبہ کیا جائے کہ غیر مسلم اقلیات کو پریشانی نہ ہو یا ان کے احساسات مجروح نہ ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر کسی مسلم یا غیر مسلم چور کا ہاتھ کاٹا جائے، کسی تہمت لگانے والے، زانی یا نشہ کرنے والے کو کوڑے لگائے جائیں یا دوسری حدود قائم کی جائیں تو اس سے کسی عیسائی یا یہودی کو کوئی پریشانی ہو سکتی ہے۔

ایک مسلمان ان احکام کو اپنے دین کے طور پر سیکھتا ہے جس کی تعلیمات پر عمل ایک عبادت ہے اور جس کے نفاذ کے ذریعے وہ خدا کا قرب حاصل کرتا ہے جب کہ غیر مسلم کے نزدیک یہ ریاستی قانون کی حیثیت رکھتے ہیں جسے عوام کی اکثریت نے منظور کیا ہے۔ اس بات کا رواداری سے قطعاً کوئی تعلق نہیں کہ مثلاً مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تعلقات اس جعلسازی اور منافقت پر مبنی ہوں جو وطنی نسبت کو دینی نسبت پر فوقیت دیتی ہو۔ یہ تصور اسلام اور مسیحیت دونوں کی تعلیمات کے خلاف بھی ہے۔

رواداری کی بنیاد اچھی ہمسائیگی، سب کے لئے اچھائی کی خواہش اور سب کے ساتھ عدل کرنے جیسی ان تعلیمات پر ہونی چاہئے جو دونوں مذاہب نے دی ہیں ۔ اور جو نعرہ سیکولر لوگ بلند کرتے ہیں کہ" دین اللہ کے لئے اور وطن سب کے لئے"تو یہ ایک لایعنی بات ہے۔ ہم اس بات کا ہر پہلو سے رد کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں:" دین اللہ کے لئے ، وطن بھی اللہ کے لئے یا دین بھی سب کے لئے اور وطن بھی سب کے لئے" یا یہ کہ" دین سب کے لئے اور وطن اللہ کے لئے"۔ ہمیں چاہئے کہ ایسی کم عقلی کی باتیں کرنا چھوڑ دیں جن کا نہ تو کوئی متعین مفہوم ہے اور جو نہ کسی مسئلے کا حل پیش کرتی اور نہ ہی کوئی دلیل بن سکتی ہیں۔

رواداری یہ نہیں کہ ہم مذاہب کے درمیان موجود بنیادی اختلافات کو ختم کر دیں کہ توحید اور تثلیث، ناسخ اور منسوخ مساوی ہو جائیں، کیونکہ اس طرح کے خیالات کا نتیجہ ان کے مقصود کے بالکل برعکس برآمد ہوا کرتا ہے اور اس کے لئے یہ ایک دوسرے کو قریب لانے کے بجائے دور کرنے اور تعمیر کی بجائے تخریب کا باعث بنتے ہیں۔

ہر دین کے لئے کچھ جوہری اقدار، ذاتی خصائص ہوا کرتے ہیں اور خیالی معرکے جیتنے اور سطحی خوش خلقی اختیار کرنے کی خاطر ان اقدار اور خصائص کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں۔

یہ باتیں مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں پر واضح ہونی چاہییں!

اشاریہ

ث

ج

چ

ح

خ

د

ذ

ر

ز

س

ش

ص

ط

ع

اسلامی معاشرے میں بنیادی انسانی حقوق کے بارے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی جاتی۔ تاریخ کے ہر دور میں یہ اصول کارفرما نظر آتا ہے۔ میثاق مدینہ ہو، خلافت راشدہ ہو یا اس کے بعد کے ادوار۔ شام و بغداد ہوں، مصر و ہسپانیہ ہوں یا ترکی و ہندوستان۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم معاشروں میں غیر مسلموں کو بڑی حد تک وہی انسانی حقوق حاصل تھے جو مسلمانوں کو تھے۔ غیر مسلموں کی جان و مال کا نہ صرف احترام کیا جاتا تھا بلکہ انہیں قانونی تحفظ بھی فراہم کیا جاتا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے لیے کسی غیر مسلم پر جبر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنے مذہب پر عمل، اپنی عبادت گاہیں قائم کرنے، اپنا خاندان تشکیل دینے، کھیتی باڑی، تجارت یا کوئی اور کاروبار کرنے، ریاست کی فراہم کردہ شہری سہولتوں سے فائدہ اٹھانے سمیت ان کے تمام حقوق تسلیم کیے جاتے تھے اور عملاً انہیں وہی تمام شہری مراعات حاصل تھیں جن سے خود مسلمان مستفید تھے۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے معاملات میں اپنے قوانین کے اجرا کا حق تھا۔ البتہ ریاست کے دفاع کی ذمہ داری جو مسلمانوں پر عائد تھی اس سے اقلیتیں مستثنیٰ تھیں۔ اس استثنیٰ کے عوض ان سے جزیے کی شکل میں ایک ٹیکس وصول کیا جاتا تھا جو ایک شہری کی حیثیت سے ملک کے دفاع میں ان کی شرکت کی ایک متبادل شکل تھی۔ یہ ٹیکس ادا کر کے انہیں ذمی کی حیثیت حاصل ہو جاتی تھی، یعنی ریاست ان کے جان و مال اور دیگر انسانی حقوق کے تحفظ کا ذمہ لے لیتی تھی۔

مشہور مصری عالم و فقیہ الشیخ یوسف عبداللہ القرضاوی نے اس موضوع پر عربی زبان میں غیر المسلمین فی المجتمع الإسلامی تصنیف کی تھی جو اس بارے میں فقہی دلائل، تاریخی حقائق اور فکری مباحث کا ایک قابل قدر مجموعہ ہے۔ کتاب کی علمی افادیت کے پیش نظر ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اس کا ترجمہ پیش کر رہا ہے۔

ادارہ تحقیقات اسلامی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔ اسلام آباد